سعید سیاح قطر میں

حکیم محمد سعید



مجلس ادارت

حکیم محمد سعید

مسعود احمد برکاتی ـــــ رفیع الزماں زبیری

ناشر : ہمدرد فاؤنڈیشن پریس

طابع : ماس پرنٹرز

اشاعت : ۱۹۹۴

تعداد اشاعت : ۲۰۰۰

قیمت : ۲۵ روپے

نونہال ادب کی کتابیں "نہ نفع، نہ نقصان" کی بنیاد پر شائع کی جاتی ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

قائدِ نونہال، تمھارے دوست جناب حکیم محمد سعید "جہانیاں جہاں گشت" ہیں۔ ان کی تو اپنی زندگی "جاگو جگاؤ" ہے۔ وہ خود بھی جاگتے رہتے ہیں اور سوئے ہوؤں کو جگاتے بھی رہتے ہیں اور پھر ان کا ہر لمحہ عمل ہی عمل ہے۔ علم اور عمل ان کی زندگی ہے۔ دراصل یہی وہ زندگی ہے جس کی تمنّا ہر انسان کو کرنی چاہیے!

قائدِ نونہال بارہا قطر گئے ہیں۔ ان کا ایک سفر ۱۹۷۹ء کا ہے اور اب تازہ سفر ۱۹۹۴ء کا ہے۔ میں نے سوچا کہ ان دونوں سفروں سیّاحتوں کو ایک جگہ کروں اور "سعید سیّاح قطر میں" ایک کتاب تیار کروں۔

نونہالو! قائدِ نونہال نے پاکستان میں بڑے انقلاب آفریں کام کیے ہیں۔ ان کے دو انقلاب آفریں کام یہ ہیں۔

۱۔ سیرتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر عالمی کانگرس۔

۲۔ ۱۴ویں صدی کے اختتام پر ۱۵ویں صدی میں داخلے پر فکر و نظر کا اہتمام۔

دنیا کو ان دونوں کی دعوت قائدِ نونہال نے دی۔ یہ ایک تاریخ ہے جسے فراموش نہیں کرنا چاہیے۔ پاکستان میں جو سیرت کانگرس ہوئی اس کی

رپورٹ الگ شائع ہوچکی ہے۔ استنبول(ترکی) کی کنگرس کااحوال بھی الگ چھپ چکا ہے۔ تیسری عالمی کنگرس دوحہ(قطر) میں ہوئی۔ اس کا حال جناب حکیم صاحب نے تمہارے لیے لکھ دیا ہے۔ اس سفر کے کوائف جناب حکیم صاحب کے فائلوں میں سے جناب عبدالرحیم پاشا نے تلاش کرکے مجھے دے دیے۔ جناب حکیم صاحب نے اس پر نظرِثانی کردی۔

اب ۱۹۹۴ء کے حالات بھی جناب حکیم صاحب نے تحریر فرمادیے۔

میں نے ان دونوں کو ایک کتاب میں جمع کردیا ہے۔ اب یہ کتاب نہایت دل چسپ ہوگئی ہے۔ یقین ہے کہ جناب حکیم صاحب کے نونہال اسے دل چسپی سے پڑھیں گے۔

قطر کے حکمراں عالی مرتبت سے جناب حکیم صاحب بارہا مل چکے ہیں۔ انھوں نے سب سے پہلے عالی مرتبت شیخ خلیفہ بن حمد الثانی کے حالات تحریر فرمائے ہیں۔ کتاب کا آغاز اسی سے کیا جارہا ہے۔

رفیع الزماں زبیری



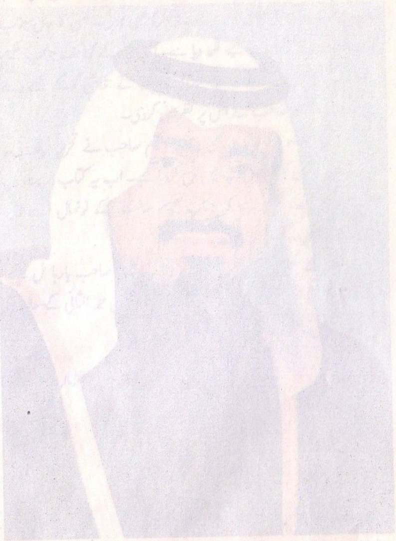
عالی مرتبت شیخ خلیفہ بن حمد الثانی ـــ امیر مملکت قطر

پہلا باب

عالی مرتبت شیخ خلیفہ بن حمد ال ثانی نے ۲۲ ر فروری ۱۹۷۲ء کو مملکتِ قطر کے امیر کی حیثیت سے اقتدار سنبھالا۔

۱۹۱۶ء کے ایک معاہدے کے تحت قطر برطانیہ کے زیر نگرانی علاقہ تھا۔ ۳ ر ستمبر ۱۹۷۱ء کو شیخ خلیفہ بن حمد ال ثانی نے ریڈیو اور ٹیلے وژن پر ایک تقریر میں اس معاہدے کو ختم کر دینے کا اور قطر کی مکمّل آزادی کا اعلان کیا۔ یہ قطر کی ایک جدید، مستحکم اور ترقی یافتہ مملکت کی حیثیت سے قیام کی راہ میں پہلا قدم تھا۔ اس کے بعد سے قطر عالی مرتبت شیخ خلیفہ بن حمد ال ثانی کی قیادت میں مسلسل آگے بڑھتا جارہا ہے۔ وہ ملک کی ترقی کے تمام منصوبوں میں ذاتی دل چسپی لیتے ہیں اور ان کی تکمیل تک مسلسل ان پر نظر رکھتے ہیں۔

عالی مرتبت شیخ خلیفہ بن حمد ال ثانی نے قطر میں شوریٰ کا اسلامی جمہوری نظام قائم کیا ہے۔ مملکت کے انتظامی امور مجلسِ وزراء چلاتی ہے جو شوریٰ (ایڈوائزری کاؤنسل) میں قوانین کا مسوّدہ پیش کرتی ہے۔ پھر سربراہِ مملکت یہ قوانین نافذ کرتے ہیں۔ امیر کو مکمّل انتظامی اور قانون سازی کے



اختیارات حاصل ہیں۔

قطر پر ہمیشہ سے ال ثانی خاندان کی حکمرانی رہتی ہے۔ یہ نام اس خاندان کے آبا و اجداد نے اختیار کیا تھا۔ ثانی بن محمدؐ جو محمدؐ بن ثانی کے والد تھے قطر کے پہلے شیخ گزرے ہیں اور انھوں نے انیسویں صدی کے وسط میں حکمرانی کی۔ ال ثانی ایک قبیلہ تھا جو اٹھارویں صدی کی ابتدا میں قطر آنے سے پہلے جنوبی نجد کے نخلستان جبرین میں آباد تھا۔ شروع میں وہ اس جزیرہ نما کے شمال میں آباد تھے لیکن بعد میں وہ محمدؐ بن ثانی کی سرکردگی میں نقل و حرکت کرکے دوحہ چلے گئے۔

ال ثانی خاندان کا سلسلہ عرب کے قبیلے تمیم سے جا کر ملتا ہے، یہ قبیلہ کسی زمانے میں جزیرہ نما عرب کے شمالی حصّے میں آباد تھا۔ قطر پر ال ثانی شیخوں اور امیروں نے ایک تسلسل سے حکمرانی کی ہے۔

جب شیخ محمد بن ثانی (۱۸۵۰ تا ۱۸۷۸) اور ان کا خاندان دوحہ میں آکر رہنے لگا تو ان کی ہمّت، جوانمردی اور پارسائی دیکھ کر دوسرے قبیلوں میں بھی حوصلہ پیدا ہوا جو امن و سکون سے رہنا چاہتے تھے اور جنھیں معاشی طور پر استحکام درکار تھا۔ انھیں آس پڑوس کے حملہ آور جنگجو قبیلوں سے تحفّظ بھی چاہیے تھا۔ ان کی حکمرانی کے وقت خلیج عرب کے پورے علاقے پر انگریزوں کا تسلّط تھا، مگر شیخ محمد بن ثانی نے انگریزوں سے تعاون کرنے کی بجائے اسلامی خلیفہ سے تعاون کرنا زیادہ مناسب سمجھا۔ انھوں نے عراق میں ترکی کے گورنر مدحت پاشا سے ایک معاہدہ کیا اور سلطنتِ عثمانیہ کی فوج کا کچھ حصّہ قطر میں رکھنے پر رضامند ہوگئے۔ اس معاہدے سے جہاں ان کے

گرد و پیش میں رہنے والوں کا اعتماد ان پر بڑھ گیا وہاں انھیں یہ اندازہ بھی ہوگیا کہ ان کی شخصیت کس حد تک مضبوط ہے۔

شیخ محمد بن ثانی کے بعد قطر پر شیخ قاسم بن محمدؐ ال ثانی (۱۸۷۸ تا ۱۹۱۳) حکمراں ہوئے۔

شیخ قاسم نے جس وقت اپنے والد سے اقتدار حاصل کیا اس وقت علاقائی اور عالمی سطح پر حالات میں بڑی تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔ قطری معاشرے کی یکجہتی اور استحکام انہی کے ذریعے عمل میں آیا، جس میں ان کی مضبوط شخصیت اور ٹھوس منصوبہ بندی کا گہرا دخل تھا۔ اس یکجہتی اور اتّحاد کی اس وقت اشد ضرورت تھی تا کہ خلیج کی ریاستوں کو بڑی طاقتوں یعنی برطانیہ اور سلطنتِ عثمانیہ کے تسلّط سے آزاد کرایا جاسکے۔

شیخ قاسم ایک سیدھے اور سچّے حکمراں تھے جنھوں نے مملکتِ قطر کی بنیاد ڈالی۔ ان کی اس صلاحیت کا اعتراف سلطنتِ عثمانیہ کی دستاویزات سے ہوتا ہے جو استنبول میں محفوظ ہیں۔

قطر کے اگلے حکمراں شیخ عبداللہ بن قاسم ال ثانی (۱۹۱۳ء تا ۱۹۴۹ء) تھے۔

شیخ عبداللہ نے اپنے والد کی زندگی میں ۱۹۰۵ء میں حکومت کی باگ ڈور سنبھال لی تھی۔ پھر وہ چالیس سال تک اس علاقے پر حکمرانی کرتے رہے۔ انھوں نے اپنے دورِ حکومت میں بہت سے نمایاں کارنامے انجام دیے جن میں قطر سے ترکوں کا انخلا، ۱۹۱۶ء میں برطانیہ سے معاہدۂ تحفّظ، ۱۹۳۹ء میں تیل کی دریافت اور اُمِّ سعید کی بندرگاہ سے ۱۹۴۹ء میں پہلی برآمد شامل

اُن کے بعد شیخ حمد بن عبداللہ ال ثانی (۱۹۴۰ء تا ۱۹۴۸ء) قطر کے حکمراں ہوئے۔ شیخ حمد کو اپنے والد کی زندگی ہی میں ولی عہد بنا دیا گیا تھا' وہ اکثر و بیشتر حکمراں کی حیثیت سے اپنے والد کی نمائندگی کرتے رہتے تھے۔ وہ اپنی مؤثر قیادت' دانائی' نیکی اور طاقتور شخصیت کی بنا پر مشہور ہوئے۔ شیخ حمد کا انتقال اپنے والد کی زندگی ہی میں ۱۹۴۸ء میں ہوگیا۔ ایک سال بعد ان کے والد نے اپنے دوسرے بیٹے شیخ علی بن عبداللہ ال ثانی کو قطر کا امیر بنا دیا اور خود امیری سے دست بردار ہوگئے۔

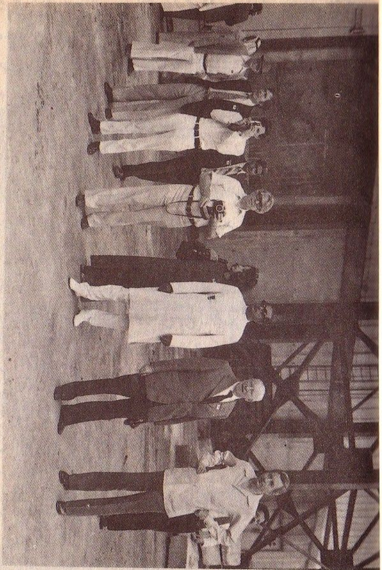
شیخ حمد بن عبداللہ' قطر کے موجودہ امیر عالی مرتبت شیخ خلیفہ بن حمد ال ثانی کے والد تھے۔

شیخ علی بن عبداللہ ال ثانی ۱۹۴۹ء میں قطر کے امیر بنے۔ ان کے دورِ حکومت میں تیل کی پیداوار میں اضافہ ہوا اور ملک نے جدید رجحانات کے ساتھ ترقی کی۔ شیخ علی ۱۹۶۰ء میں حکومت سے دست بردار ہوگئے اور انھوں نے اپنے بیٹے شیخ احمد کو حکمرانی سونپ دی۔ شیخ احمد ال ثانی نے ۱۹۷۲ء تک حکومت کی' اس کے بعد ان کے نائب' ولی عہد اور بھتیجے عالی مرتبت شیخ خلیفہ بن حمد ال ثانی نے حکومت سنبھالی۔ ان کو اپنے خاندان' قطر کے لوگوں اور مسلّح افواج کی بھرپور حمایت حاصل تھی۔

عزت مآب امیر کے دور میں اس ملک نے بھرپور ترقی کی اور اس کا استحکام بڑھا۔ ان کی دانائی معاملہ فہمی اور سیاسی سوجھ بوجھ کی بنا پر جدید قطر کو اقتصادی' معاشی اور ثقافتی عروج حاصل ہوا ہے۔

پٹرول کی دریافت

۱۹۴۰ء کی ابتدا میں پٹرول کی دریافت سے خلیجِ عرب کے اس خطّے نے عام طور پر اور قطر نے خاص طور پر بہت ترقی کی۔ ایک طویل عرصے تک موتیوں کی برآمد پر اس خطّے کی بقا کا انحصار تھا مگر پٹرول نے اس کے متبادل کی حیثیت سے جگہ لے لی۔ تیل کی برآمد نے جہاں قطر کو اقتصادی استحکام بخشا اور اس ملک میں خوشحالی آئی وہاں عالمی سیاست میں بھی اسے ایک مناسب مقام عطا کیا۔ پٹرول یہاں مارکیٹ میں خرید و فروخت کے لیے ۱۹۳۹ء میں لایا گیا تھا اور پھر ۱۹۴۹ء میں پہلی بار اُمِّ سعید کے راستے برآمد کیا گیا۔



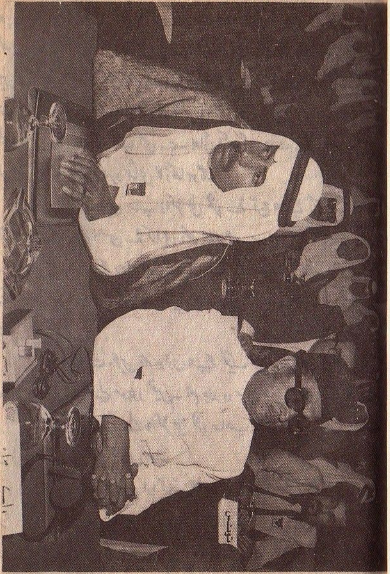
حکیم محمد سعید، اُم سعید، ودود احمد انڈر سیکرٹری، کنگ عبدالعزیز یونیورسٹی میں عالمی تاریخ جزیرۃ العرب میں شریک دوسرے مندوبین کے ساتھ

دوسرا باب

میرے عظیم نونہالو!

اب آؤ ذرا قطر کے دارالحکومت دوحہ چلتے ہیں، مگر راستے میں ذرا بحرین اتر جائیں گے۔ ہاں خوب یاد آیا۔ بحرین میں پہلی بار ۱۹۲۷ء میں آیا تھا۔ اس وقت میں بس سات سال کا تھا۔ اپنی والدہ محترمہ کے ساتھ حجِ بیت اللہ کے لیے کراچی سے روانہ ہوا تھا۔ اس زمانے میں کراچی کی آبادی زیادہ سے زیادہ دو لاکھ ہوگی۔ اب کوئی اَسّی لاکھ ہے!

ہاں تو بحرین ۱۹۲۷ء کی بات ہو رہی تھی۔ اس وقت بحرین بس ایک جزیرہ تھا۔ جب یہاں بحرین کے ساحل پر ہمارا جہاز ایس۔ ایس علوی ٹھیرا تو چھوٹی چھوٹی کشتیوں میں میری عمر کے درجنوں نونہال جمع ہوگئے۔ وہ بخشش کے طالب تھے۔ ہم نے اوپر سے سکّہ پھینکا، وہ پانی میں گرا ہر نونہال نے ڈبکی ماری اور سکّہ نکال لایا۔ وہ بہت خوش تھا اور میں خاصا حیران۔ میں نے غور کیا کہ کیا میں اس طرح ڈبکی مار سکتا ہوں! توبہ اللہ! مگر اب بحرین تو بڑی جگہ ہے۔ یہ تو اب ایک ملک بن گیا ہے۔ ترقی یافتہ ملک! ۱۹۲۷ء کے بعد ۱۹۷۹ء میں بحرین دیکھ کر دل خوش ہوگیا۔



حکیم محمد سعید [illegible] تاریخ جزیرۃ العرب [illegible] میں

یہاں بحرین میں میرے عزیز دوست جناب حکیم محمد احسن پاکستان کے سفیر ہیں۔ بس سوچا ان سے ملاقات کرلینی چاہیے۔ یہاں سے دوحہ اُڑ چلیں گے۔ ہوائی جہاز بحرین مطار (ائرپورٹ) پر اترا۔ جناب بھائی حکیم محمد احسن صاحب نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔

۲۳ر نومبر ۱۹۷۹ء جُمعتہ المُبارک

بحرین

ہم دونوں دوست ایک بجے کے بعد تک باتیں کرتے رہے۔ عرصہ دراز کے بعد ہم کو اتنی فرصت ملی ہے۔ بھائی احسن صاحب نے سفارت کا راستہ اختیار کیا۔ ان کی سیاسی تربیت میں محترمی سر ظفراللہ صاحب کو کم دخل نہیں ہے، مگر ان کے خاندان میں سیاست کا دَور ہمیشہ رہا ہے اور ان کا ماحول سیاسی رہا ہے، اس لیے وہ اس میدان میں کام یاب رہے ہیں۔ خود حکیم محمد احسن میں ذاتی صلاحیتیں ہیں، اور ایسی ہیں کہ کم لوگوں میں ہوتی ہیں۔ سندھ میں وہ ایسے لوگوں میں شمار ہونے چاہییں جن کو جینئس کہا جاسکتا ہے۔ میں ان کو بچپن سے ہی جانتا ہوں اور ان کی صلاحیتوں کا معترف ہوں۔ اقوامِ متحدہ میں وہ پاکستان کی بڑی اہم خدمات انجام دے چکے ہیں اور پھر یوگوسلاویا، عراق، افغانستان، قطر وغیرہ ممالک میں سفارتی فرائض بڑی خوبی کے ساتھ انجام دیتے رہے ہیں۔ ان دنوں وہ "عوامی سیاسی دباؤ" کے تحت بحرین میں سفیرِپاکستان ہیں حال آں کہ ان کو اب کسی ایسے بڑے ملک میں سفیرِپاکستان ہونا چاہیے کہ جہاں رہ کر یہ وطن عزیز کی اہم خدمات انجام دے سکیں۔

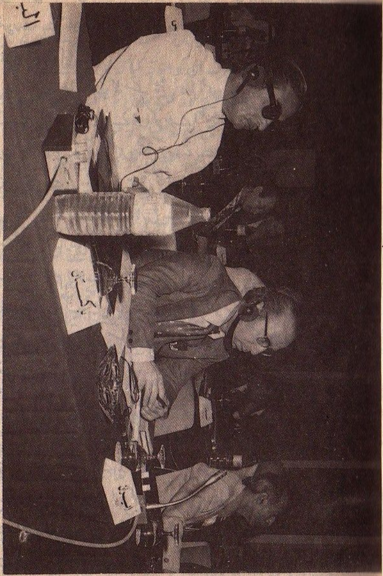
صبح نمازِ فجر قضا ہوگئی۔ بھائی احسن کی اہلیہ کراچی میں مشہور لیڈی

ڈاکٹر عباسی ہیں۔ ان کی تعلیم بھی دہلی میں ہوئی ہے۔ لیڈی ہارڈنگ کالج میں وہ پانچ سال ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کرتی رہیں اور میری بہن بن کر رہی ہیں۔ انھوں نے اعلا تعلیم بھی حاصل کی ہے اور وہ اپنی خاندانی روایات کی طرح ذہین و فطین ہیں اور بڑی کام یاب لیڈی ڈاکٹر ہیں۔ لیڈی ڈاکٹر مہرالنسا عباسی سندھ کی معروف شخصیت قاضی محمد اکبر کی بہن ہیں۔ اس خاندان سے مجھے قلبی تعلق رہا ہے، اور اب بھی ہے۔ بھائی اکبر کی رحلت نے میرا دل اسی طرح دُکھایا جس طرح مہرو عباسی کا دُکھا ہوگا۔

وزیرِ صحت بحرین جناب ڈاکٹر علی فخرو نے آج ۹ بجے صبح ملاقات کا وقت دیا ہے۔ بھائی احسن نے کراچی مجھے اطلاع دے دی تھی۔ ہم دونوں گھر سے ساڑھے آٹھ بجے روانہ ہوئے۔ میں نے پہلے سفارۂ پاکستان جاکر اسے دیکھا۔ الحمدللہ اب وہ اچھی جگہ آگیا ہے۔ بھائی احسن صاحب کو اطمینان ہے۔

وزارتِ صحت بحرین ہم دونوں ۹ بجے ٹھیک پہنچ گئے۔ ان کی سکریٹری صاحبہ استقبال کے لیے موجود تھیں۔ ہم جلد دوسری منزل پر ان کے کمرے میں پہنچ گئے اور دوسرے لمحے ڈاکٹر علی فخرو صاحب آگئے، اور پُرتپاک ملے۔ ان کی جانب سے اظہارِ خلوص ہوا۔

میں نے ان کا شکریہ ادا کیا کہ انھوں نے اپنے سفر کو منسوخ کرکے آج جمعہ، تعطیل کے دن میرے لیے وقت نکالا۔ ذرا سی دیر میں تکلفات ختم ہوگئے اور ہم نے کام کی باتیں شروع کردیں۔ میں نے بحرین اور پاکستان میں باہمی تعاون و اشتراک پر ان سے باتیں کیں۔ انھوں نے اعتراف کیا کہ حکیم



ہانگ کانگ میں کانفرنس کا ایک منظر۔ حکیم محمد سعید ایرانی مندوب کے ساتھ بیٹھے ہیں

محمد احسن نے اس کے لیے اہم اقدامات کیے ہیں۔ وہ ان سے بڑے متاثر ہیں۔ میں نے ان کے مسائل کو سمجھا ہے۔ ان کو نرسوں اور ڈاکٹروں کی ضرورت ہے، اور وہ پاکستان سے یہ اسٹاف چاہتے ہیں۔ میں نے ان سے تعاون کا وعدہ کیا ہے۔

اب عربی طب کا مسئلہ پیش ہوا جس کے لیے میں ان سے ملاقات کے لیے آیا ہوں۔ میں نے ان کو بڑے اطمینان سے بتایا کہ اب تک دنیائے عرب و اسلام نے اپنے اس قیمتی ورثے سے صرفِ نظر کیا ہے، اور یہ ایک ایسی غلطی ہے کہ جس کی تلافی کا اب نئے حالات میں سامان ہونا چاہیے۔ میں نے ان کو توجہ دلائی کہ تاریخ کے متعدد رشتے منقطع ہوگئے ہیں اور طب و سائنس کا تاریخی سلسلہ غیر مربوط ہوگیا ہے جس کی وجہ سے عرب علمائے طب اور مسلم زعمائے سائنس کے طبّی و سائنسی کارنامے پردۂ خفا میں چلے گئے ہیں اور لوگ نہیں جانتے کہ آج طب و سائنس کے شان دار محل کی تعمیر میں خود عربوں اور مسلمانوں کے انکشافات اور اکتشافات نے کیا اور کتنا حصّہ لیا ہے۔

ڈاکٹر علی فخرو صاحب عالمی ادارۂ صحت سے متعلق رہے ہیں اور ان کو اعلا خدمات کے صلے میں ڈاکٹر توفیق شوشا پاشا ایوارڈ بھی ملا ہے، جس کے لیے میں نے ان کو پہلے بذریعہ خط مبارک باد دی تھی اور اب اپنے بحرین آنے سے قبل میں نے ان کو طبِ اسلامی کے ذیل میں پاکستان کے اقدامات سے باخبر رکھا تھا۔ میں نے ان کو عالمی ادارۂ صحت کے ۳۰ ویں اسمبلی کے فیصلے کی طرف توجہ دلائی کہ اب اس تجویز کی روشنی میں افریقہ اور ایشیا میں

علاقائی طبوں کی منصوبہ ہائے صحت میں شمولیت کا راستہ کھل چکا ہے۔ اس لیے بھی اب غور کرنا چاہیے۔

میں نے ان کو اوسٹریلیا میں منعقدہ طبّی کانفرنس کے بارے میں بتایا، اور اپنے آخری خط کی طرف ان کو متوجہ کیا کہ جو میں نے ان کو لکھا تھا کہ اوسٹریلیا کانفرنس میں طبِ چینی اور طبِ ہندی کا غلغلہ بلند ہوا اور دنیا بھر کے ماہرین طب و سائنس نے ان ہی دو طبوں کو موضوع فکر و تحقیق بنایا ہے۔ طبِ عربی/ اسلامی کے بارے میں تحقیق و فکر کا میدان ہنوز بند ہے اور اس کے خود ہم ذمّہ دار ہیں۔ آخر کیا وجہ ہے کہ ہم طبّی اصول و نظریات اور علاج کے میدان میں طبّی نوادر کو موضوع فکر و تحقیق بنانے کے لیے پیش نہ کریں۔ اس میدان میں خود ہمارا اپنے قیمتی اثاثۂ مِلّی سے صرفِ نظر اس راہ میں حائل ہے۔ یہ صورتِ حال کسی طرح ہمارے لیے صحیح نہیں ہے۔

ڈاکٹر علی فخرو صاحب نے میری بات کو بڑے اطمینان سے سمجھ لیا ہے اور ان کی جانب سے پوری تائید ہوئی ہے۔ میں نے جب ان کو بتایا کہ ایسٹرن میڈیٹیرنین ریجن عالمی ادارۂ صحت کے ڈائریکٹر ڈاکٹر تابا اس میں بڑی گہری دل چسپی لے رہے ہیں تو ڈاکٹر فخرو صاحب نے مشورہ دیا کہ شرق اوسط کے وزرائے صحت کو اس موضوع پر بیٹھ کر غور کرنا چاہیے اور کیوں نہ یہ میٹنگ پاکستان میں ہو! میں نے ڈاکٹر فخرو صاحب کی رائے سے اتفاق کیا اور ان کو مشورہ دیا کہ وہ عالمی ادارۂ صحت میں اس نوع کی تحریک کریں۔

میں نے ان کو قطر میں ۸ / اکتوبر ۱۹۷۹ء میں عرب وزرائے صحت کی کانفرنس میں ان کے چیئرمین بننے پر مبارک دی جس کا علم مجھے عالمی ادارہ

صحت کے ایسٹرن میڈیٹرینین ریجن کی پریس ریلیز سے ہوا تھا اور یہ رپورٹ میرے ساتھ تھی۔

حکیم محمد احسن صاحب نے ڈاکٹر فخرو صاحب سے میری ملاقات اور تبادلِ خیال کے لیے تمام سفارتی آداب کی روشنی میں انتظام کیا تھا اور ملاقات سے قبل ملاقات کی کامیابی کے لیے راہوں کو ہموار کردیا تھا۔ اس میٹنگ میں ان کا رویّہ خالصاً سفیر کا رہا اور یہ فرائض انھوں نے بڑی خوش اسلوبی سے سرانجام دیے۔ ڈاکٹر فخرو صاحب سے دورانِ گفت گو کویت کے وزیرِ صحت کے طب کے بارے میں اقدامات کا ذکر بھی آیا۔ اس پر انھوں نے بتایا کہ کویت میں اگلے سال طبِ اسلامی پر ایک عالمی کانفرنس ہو رہی ہے۔ اس پر میں نے ان کو بتایا کہ بحیثیت مشیرِ اسلامی سکرٹری ایٹ جدّہ میں مَیں نے ہی کویت کو تاریخ ''الاٹ'' کی ہے' اور میں اس کی پلاننگ کے لیے خود بھی اسلامی سکرٹری ایٹ کی جانب سے انتظامات کے لیے کویت جاؤں گا۔

اس کے علاوہ حکیم محمد احسن صاحب نے ان کو میری سرگرمیوں سے باخبر کردیا تھا۔ لہٰذا یہ میٹنگ ہائی لیول پر ہوئی اور بڑی کامیاب رہی۔ ڈاکٹر فخرو مشرقی اور عرب روایات کے امین ہیں' وہ نیچے موٹر تک چھوڑنے آئے۔ ویسے بھی وہ نہایت خوش مزاج انسان ہیں۔ امریکی جامعات سے فارغ التحصیل ہیں۔

وزارتِ خارجہ بحرین کو حکیم محمد احسن صاحب نے میری آمد کی اطلاع دے دی تھی' اور اس کا اصرار تھا کہ میں سرکاری مہمان ہوں، مگر ایسا ممکن نہ تھا۔ میں بھائی احسن کے گھر کے علاوہ کیسے دوسری جگہ ٹھہر سکتا تھا۔

میں نے اس بات کو بڑی اہمیت کے ساتھ نوٹ کیا ہے کہ حکیم محمد احسن صاحب اس تمام کام میں سفیرِ پاکستان رہے اور انھوں نے ایک سفیر کی حیثیت سے تمام اقدامات کیے اور جب ہم میٹنگ سے فارغ ہوگئے تو ہم پھر پیارے دوست ہوگئے اور سیرِ بحرین کے لیے نکل پڑے۔

طبیہ کالج دہلی میں ہمارے ایک مشترکہ دوست قاسم بہزاد تھے۔ بڑے ہی شائستہ اور شُستہ انسان۔ سنجیدہ اور متین۔ وہ بحرین کے تھے اور اب بھی ہیں۔ بہزاد فارمیسی بحرین میں ان ہی کی ہے۔ اب ان کے بڑے صاحبزادے بھی ڈاکٹر بن کر بحرین آگئے ہیں، میں کراچی میں ان کی دیکھ بھال کرتا رہا ہوں۔ میں ان سے ملنے کے لیے آج گیا۔ مگر جمعہ کی وجہ سے تعطیل تھی۔ بارے میں نے ان کی دُکان میں اپنا کارڈ ڈال دیا ہے۔ ان کی ڈسپنسری عین بازارِ قدیم میں ہے' اس طرح بحرین کے یہ بازار بھی دیکھ لیے!

بحرین کا میرا پہلا سفر

نونہالو! جیسا کہ میں نے ابھی تمھیں بتایا کہ میں پہلی بار ۱۹۲۷ء کے ابتدائی مہینوں میں بحرین آیا تھا۔ شاید اپریل کا مہینہ تھا۔ علوی جہاز کے کپتان سے بڑی بے تکلفی ہوگئی تھی اور اس نے مجھے اور بھائی وحید (مرحوم) کو عرشہ جہاز پر بے روک ٹوک آنے جانے کی اجازت دے دی تھی۔ ہم اپنی غربت کی وجہ سے ڈیک کے مسافر تھے' اور ڈیک کے مسافروں کے لیے عرشہ جہاز کی تازہ ہوا بڑی رُوح پَرور ہوتی تھی۔ کراچی سے شاید تین دن بعد ہمارا جہاز بحرین کی بندرگاہ پر رکا تھا۔ شہر میں جانے کی اجازت نہیں تھی۔ بندرگاہ سے اندازہ ہوتا تھا کہ بحرین کا شہر کیا ہوگا۔ بس کچے مکانوں اور جھونپڑیوں کی

آبادیاں ادھر اُدھر ہوں گی۔ عرشہ جہاز پر بحرین کے جو ملاح صفائی وغیرہ کے لیے آئے تھے اور جہاز کے آس پاس جو کشتیوں میں سوار تھے ان کا حال ان کی غربت کا گواہ تھا۔ ایسا یاد آتا ہے کہ وہ کشتیوں میں فروخت کے لیے کچھ سامان لائے تھے۔ مچھلیاں وغیرہ تھیں شاید۔

شب گزشتہ وزارتِ صحت بحرین کے نمائندے نے سوال کیا تھا:

"کیا آپ پہلی بار بحرین تشریف لائے ہیں؟"

"نہیں، یہ میرا دوسرا سفر ہے۔ پہلا ۱۹۲۷ء میں تھا!"

نمائندہ وزارت صحت مسکرائے بغیر نہ رہ سکے، اور حکیم محمد احسن صاحب سے مخاطب ہوکر فرمایا: "یورایکسی لنسی، ہزایکسی لنسی حکیم محمد سعید کو ۱۹۲۷ء اور ۱۹۷۹ء کا فرق ضرور معلوم ہونا چاہیے۔"

آج میں صبح جناب وزیرِ صحت بحرین سے ملاقات اور اس ملاقات میں حسب منشا کامیابی کے بعد بحالتِ مُسرّت و اطمینان "بحرین گردی" کے لیے بھائی احسن صاحب کے ساتھ نکلا تو میں واقعی حیران رہ گیا۔ بحرین کے بارے میں میرے تصوّر میں بھی نہ تھا کہ یہ جزیرہ یا ملک اس قدر ترقی یافتہ ہوگا اور اس درجہ تہذیب و شائستگی کا یہاں دَور دَورہ ہوگا!

شبِ گزشتہ ہوائی میدان بجائے خود میرے لیے وجہِ حیرت تھا اور ہوائی میدان کی عمارت کو تو دیکھ کر میں یقین نہیں کرسکتا تھا کہ میں مشرق میں ہوں۔ اس درجہ ترقی یافتہ اور اس درجہ صاف ستھرا اور اس درجہ ماڈرن ہوائی میدان کا پاکستان میں آئندہ برس ہا برس تک تصوّر نہیں کیا جاسکتا۔ یہ ہوائی میدان ہیتھرو(لندن) کے انداز پر بنا ہوا ہے، مگر اس سے زیادہ پاک

صاف ہے۔

نونہالو! آج شہر دیکھا، عمارات کو دیکھا، بلند و بالا عمارتیں، طرزِ تعمیر جدید اور عمارتی سامان درآمد کردہ اور بہترین، حُسن اور سلیقہ سب حیران کردینے والے ہیں۔ بحرین کی مدد سعودی عرب اور کویت دونوں جگہ سے ہوتی ہے، مگر اس مالی امداد و تعاون کا جس درجہ سلیقے سے یہاں استعمال ہوا ہے اس کی تعریف کیے بغیر رہا نہیں۔

کوئی ۱۹۵۲ء یا ذرا آگے پیچھے کی بات ہے کہ شیخ البحرین، کراچی تشریف لائے تھے۔ وہ کراچی کے ہوٹل میٹروپول میں ٹھیرے تھے۔ اس زمانے میں کراچی میں یہی ایک ہوٹل تھا۔ سیّد عبدالمنعم العدوی صاحب (مدیر العرب) کے ساتھ میں شیخ البحرین کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ میں نے ان کو طِبّی مشورہ دیا تھا اور ادویہ بھی ان کی خدمت میں پیش کی تھیں۔ شیخ البحرین نے مجھے ایک موتی عطا فرمایا تھا۔ یاد نہیں کہ یہ موتی کہاں رکھا ہے۔ آج بحرین میں اس ملاقات کی یاد تازہ ہوئی۔ وہ شیخ البحرین تو اب جنّت الفردوس کے مقامِ اعلا پر ہیں۔ اگر وقت ملتا تو موجودہ شیخ البحرین سے ضرور ملتا اور ان کے حُسنِ انتظام کی داد دیتا۔ نمازِ جمعہ اس مسجد میں ادا کی کہ جہاں شیخ البحرین (بادشاہ) ادا کرتے ہیں۔ مگر وہ ان دنوں ملک سے باہر ہیں۔ نمازیوں میں بڑی تعداد پاکستانیوں کی دیکھی۔ نمازِ جمعہ میں حد سے زیادہ عجلت عبادت کو بے لطف کردیتی ہے۔ بارے میں نے نمازِ جمعہ کا لطف اٹھایا۔

آج بھائی احسن صاحب نے میرے اعزاز میں تیلیوں کے کلب میں ظہرانہ مرتّب کیا تھا، یعنی یہ کلب ان لوگوں نے بنایا ہے کہ جو بحرین کے تیل

کے نکالنے، جمع کرنے اور صاف کرنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ سب گورے ہیں۔ ان کے کلب میں سفرا رکن بن سکتے ہیں۔ بہت سے پاکستانی تھے۔ اخبار خلیج کے نامہ نگار بھی آئے تھے اور ایک بڑی دل چسپ اور بزرگ شخصیت بھی آئی تھی جن کو بحرین میں مقام عزّو شرف حاصل ہے۔ یہ الاستاذ ابراہیم العریض ہیں۔ انگریزی جانتے ہیں، اردو خوب بولتے ہیں۔ فارسی خوب جانتے ہیں اور اردو عربی اور فارسی کے شاعر بھی ہیں۔ کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ وزارتِ خارجہ میں سفیر کی حیثیت سے کام بھی کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنی ایک نظم

"پندرھویں صدی ہجری کی ملے عید مبارک"

مجھے طبع شدہ دی، اور اصرار کیا کہ میں اس کو اطمینان سے پڑھوں۔ میں نے اسے جیب میں رکھ لیا۔ آج ظہرانے میں ان سے میں باتیں کرتا رہا۔ بزلہ سنج ہیں، کھانے پر لطائف وظرائف بھی ان کی طرف سے ہوتے رہے۔ گھر آگئے۔ ہم دونوں نے آرام کیا اور یہ فیصلہ کیا کہ اب باہر جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ بھائی احسن صاحب نے کسی ریستوراں میں کھانے کا انتظام کیا تھا، مگر دن کو میں نے جتنا کھالیا ہے اب رات کو ضرورت نہیں ہے کھانے کی۔

ٹیلے وژن پر ایک ہندستانی فلم "دھمکی" دکھائی جارہی تھی۔ عرصہ دراز ہوا کہ کوئی فلم دیکھنے کا موقع نہیں ملا ہے۔ آج یہ فلم دیکھ لی۔ بڑی الجھی ہوئی کہانی ہے۔ میں بہ مشکل ہی سمجھ سکا۔

نونہالو! گلف ائرلائنز کا جہاز بحرین سے اب مجھے دوحہ لے جائے گا۔

ہم آٹھ بجے ہوائی میدان پر آگئے۔ اعلا انتظامات میں مَیں جہاز پر سوار ہوگیا۔ وزارتِ صحت کے نائب وزیر صاحب اللہ حافظ کہنے آئے تھے۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ بھائی احسن صاحب سے گلے ملا۔ انھوں نے اصرار کیا ہے کہ میں ان کے صاحبزادے اظہر کا خیال رکھوں کہ جو ان دنوں ڈاکٹری کا امتحان دے رہے ہیں۔ ان کی اہلیہ لیڈی ڈاکٹر مسز عباسی فرینکفرٹ میں اپنے بیٹے کے ساتھ ہیں۔ اس بار حج میں ان کا پاؤں پھسل گیا اور ترقوہ (ہنسلی کی ہڈی) ٹوٹ گئی ہے۔ جرمنی میں زیرِ علاج ہیں۔

کوئی ۳۵ منٹ میں گلف ائرلائنز کے صاف ستھرے ہوائی جہاز نے دوحہ پر آکر اتار دیا۔ یہاں سوم کنگرس عالمی سیرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے نمائندگان موجود تھے۔ انھوں نے پُرجوش استقبال کیا۔ ساتھ کراچی سے بھی جہاز آیا ہے اور پروفیسر خورشید احمد صاحب اس سے اترے ہیں۔ بمبئی کا جہاز بھی آیا ہے اور اس میں ہندستان کے نمائندے آئے ہیں۔ ان میں جماعتِ اسلامی ہند کے صدر مولانا محمد یوسف صاحب بھی آئے ہیں۔ وی آئی پی روم میں بڑی گہما گہمی ہے۔ سفارتِ پاکستان میں قائم مقام سفیر جناب محترم مظہر صاحب بھی لینے آئے تھے۔ میں سفارت خانے کی موٹر میں ہوٹل خلیج آگیا۔ یہاں بہت سے احباب ملے۔ محترمی جناب ظفرالاسلام صاحب بھی ملے۔ ان سے ذرا دیر باتیں ہوئیں۔ رات کے دس بج چکے تھے۔ میں کمرہ نمبر ۵۳۴ میں آگیا۔ شرق اوسط میں فندق الخلیج ایک بڑا ہی شان دار ہوٹل ہے۔ میں ڈھائی تین سال پہلے بھی یہاں رہ گیا ہوں۔

نونہالو! پیارے نبی ﷺ دنیا کے سب سے بڑے انسان ہیں۔

آج ساری دنیا ان کو بڑا تسلیم کرتی ہے۔ ان کی پوری زندگی نہایت شان دار ہے۔ زندگی کے لاتعداد پہلو ہیں۔ ہم جتنا غور کرتے ہیں ان کی زندگی کے راز عیاں ہوتے جاتے ہیں اور انسان ان سے سبق حاصل کرتا رہتا ہے۔

درحقیقت پیارے نبی ﷺ کی زندگی قرآنِ حکیم کی تفسیر ہے۔ یہ تفسیر علم و حکمت کی ایک دنیا ہے۔ غیر محدود، لامتناہی!

میں نے پاکستان میں ایک عالمی کنگرس سیرت نبوی ﷺ منعقد کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے پورا نقشہ بنایا۔ دنیا بھر کے عالموں کو دعوت دی۔ یہ وہ کام تھا کہ اس پیمانے پر دنیا میں کسی نے نہیں کیا تھا۔

نونہالو! اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ توفیق دی اور مجھے یہ اعزاز دیا کہ میں اس قدر بڑا کام کر گزروں! میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ بڑے کاموں کے لیے وہ تجویز میرے ذہن میں ڈال دیتے ہیں اور مجھے عمل کی قوت بھی عطا کردیتے ہیں۔

نونہالو! جب پورا نقشہ تیار ہوگیا اور میں نے اسے ظاہر کردیا تو پاکستان میں سب حیران رہ گئے۔ کیسے یہ سب کام میں نے کرلیا اور ہمدرد نے کیسے اس قدر بڑے کام کی پوری مالی ذمہ داری سنبھال لی۔ کسی کو یقین نہیں آتا تھا!

نونہالو! تم جانتے ہو کہ میں تو کام کا جن ہوں! چھوٹا کام کرتا ہی نہیں ہوں۔ بڑے کام کرنے کی طاقت مجھے اللہ تعالیٰ نے بخشی ہے۔

نونہالو! یہ زمانہ جناب محترم ذوالفقار علی بھٹو صاحب کا زمانہ تھا۔ وہ

وزیراعظم پاکستان تھے۔ ان کو دنیائے اسلام سے گہرا شغف تھا اور وہ اس کی آرزو رکھتے تھے کہ وہ دنیائے اسلام کے رہنما بن جائیں اور وہ ضرور بن جاتے، مگر اس کے لیے ایک ایسے مزاج کی ضرورت تھی جس میں صبر و قناعت ہو۔ جس میں انسان کا احترام ہو اور انسان سے محبّت ہو۔

نونہالو! ان دنوں میرے نہایت عزیز دوست محترم مولانا کوثر نیازی وزیر مذہبی امور تھے۔ ان کو جب "کنگرس عالمی سیرت نبوی ﷺ" کے پروگرام کا علم ہوا تو بے چین ہوگئے۔ بھٹو صاحب کو جب انھوں نے میرے پروگرام کی تفصیل بتائی تو ان کو اس کنگرس سے گہری دل چسپی پیدا ہوگئی۔ اب نہایت بے تکلفی کے ساتھ محترمی مولانا کوثر نیازی صاحب نے مجھے مشورہ دیا، اور پھر درخواست کی کہ اس میں حکومت کو میں ساتھی بنالوں۔ میں انکار نہیں کرسکا اور پھر طے یہ پایا کہ ہمدرد اور حکومت دونوں مل کر یہ عالمی سیرت کنگرس منعقد کریں گے!

۲۴ر نومبر ۱۹۷۹ء ہفتہ

دوحہ قطر

ان دنوں دوحہ (قطر) میں نماز فجر کا وقت صبح ۴ بج کر ۲۹ منٹ پر ہوجاتا ہے۔ آج میری نماز قضا ہوگئی ہے۔ بڑی شرمندگی ہے۔ میں جب تیار ہوا تو تقریباً سات بج گئے تھے۔ بارے میں نے چار نفل ادا کرلیے اور اپنی میز پر بیٹھ گیا۔ شبِ گزشتہ میں نے تمام سامان اور کاغذات کو مرتب کرلیا تھا۔ اب صبح میں نے تیسری کانفرنس سیرت نبوی ﷺ کے پروگرام کو سمجھنے کی کوشش کی۔ زیادہ تر کاغذات عربی زبان میں ہیں، تاہم کام چلانے کے لیے انگریزی

میں بھی لٹریچر موجود ہے۔ ایک گھنٹے کے مطالعے کے بعد کانفرنس کا مزاج و پروگرام سمجھ میں آسکا۔

ایک فروگزاشت

نونہالو! پروگرام کا پیش لفظ میں نے بڑی تکلیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس میں یہ لکھا گیا ہے کہ تیسری کنگرس عالمی سیرت نبوی ﷺ منعقد کرنے کا خیال دوسری کنگرس میں آیا کہ جو استنبول میں ہوئی تھی۔ اس پورے پیش لفظ میں اوّلین کنگرس عالمی سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی ذکر اور اشارہ تک موجود نہیں ہے۔ میں کم سے کم اس بارے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ یہ ایک بدیہی فروگزاشت ہے۔ اس پیش لفظ کے ہر پڑھنے والے ذہن میں لازماً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پہلی کنگرس آخر کہاں ہوئی تھی؟ اگر یہ نہیں بتایا جائے گا کہ پہلی کنگرس پاکستان میں ہوئی تھی، اور پاکستانی کنگرس میں طے پاجانے کے مطابق دوسری کنگرس ترکی (استنبول) میں ہوئی تھی، اور اب تیسری دوحہ (قطر) میں ہورہی ہے تو تاریخ نامکمل رہ جائے گی۔ مجھے اس فروگزاشت پر ذہنی اور قلبی تکلیف ہوئی ہے۔ پاکستان کو نظرانداز کردینا ہی میرے لیے وجہ تکلیف ہے۔

دو تاریخی حقائق

میرے لیے یہ مناسب ہے کہ کسی تکلّف کے بغیر میں دو تاریخی حقائق رکارڈ کردوں۔ میرے پاس ان تاریخی حقائق کے شواہد موجود ہیں۔

پہلی تاریخی حقیقت

یہ ہے کہ پاکستان میں ایک "کنگرس عالمی سیرت نبوی ﷺ"

منعقد کرنے کا خیال تھا میرے ذہن میں آیا۔ میں نے ہی اس کا پلان تیار کیا۔ اس کا پیش لفظ جناب بروہی صاحب کی مدد سے میں نے لکھا اور پھر ایک منصوبہ تیار کرکے اس وقت کے وزیر مذہبی امور جناب مولانا کوثر نیازی صاحب سے ذکر کیا اور ان سے ایک عالمی کنگرس سیرت نبوی ﷺ کے انعقاد کی اجازت مانگی۔ حکومتِ پاکستان کے قانون کے مطابق کوئی بین الاقوامی کنگرس متعلقہ وزارت اور حکومت کی اجازت کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ محترمی مولانا کوثر نیازی صاحب نے میری رائے سے اتفاق کیا، اور کافی تبادلِ خیال کے بعد ہم آخرکار اس امر پر متفق ہوئے کہ وزارت مذہبی امور اور ہمدرد کو نصف نصف کے اصول پر اشتراک باہمی کرنا چاہیے۔

نونہالو! میں نے جب اس کنگرس کا پلان تیار کیا تھا اس وقت مولانا سے تبادلِ خیال کے بعد کسی بھی مرحلے پر یہ خیال ذہن میں نہیں آیا تھا کہ یہ دینی و علمی پیش رفت کسی عنوان ایک سیاسی رنگ اختیار کرسکتی ہے، مگر ہوا یہی کہ آخرکار اس کی حیثیت سیاسی سے زیادہ حکومت کے استحکام کی ہوگئی، بایں ہمہ میں نے انتہائی جدوجہد کرکے اس کے علمی مقام کو ہرزد سے بچالینے میں کامیابی حاصل کرلی، گو ایسا کرنے میں مجھے بڑی شدید مشکلات کا سامنا ہوا اور ایک پہلو اس کے حسابات کا تھا، جسے میں نے ہر قیمت اپنے کنٹرول میں رکھا، اور حسابات کے لیے میری شدّت پسندی نے قطعی طور پر صَرفِ بے جا کا راستہ بہت بڑی حد تک بند کردیا مگر وزارت مذہبی امور میں مَیں نے اپنی بڑی ناروا مخالفت کا دروازہ کھول دیا۔ اس کنگرس کے دوران ایک شخصیاتی مناقشہ (پرسنیلیٹی کلیش) بھی ہوا، جس کی سزا مجھے طرح طرح سے ملتی رہی۔

میں یہاں اس کی تفصیل سے گریز کرتا ہوں۔

دوسری تاریخی حقیقت

یہ ہے کہ اسلام کے چودہ سو سال اور ۱۵ ویں صدی میں داخلے کے موقع پر ایک عالمی جدوجہد کو سب سے پہلے میں نے سوچا۔ میرا اندازِ فکر یہ تھا کہ ہم اپنے گزشتہ ۱۴ سو سال کا جائزہ لیں، اپنی غلطیوں اور کامیابیوں کا احاطہ کریں اور ایک حقیقت پسندانہ چودہ سو سالہ جائزہ لے کر ۱۵ ویں صدی کے لیے ایک لائحہ عمل تیار کریں، اور آنے والی نسلوں کے لیے اپنی ہمہ جہت پیش رفت سے راہِ عمل تجویز کردیں۔ یہ ان دنوں کی بات ہے کہ جب فروری ۱۹۷۴ء میں لاہور میں اسلامی سربراہ کانفرنس ہو رہی تھی۔ میں نے اس موقع پر ایک مراسلہ سرکولیٹ کیا، اور اہتمام کے ساتھ ہر اہم شخصیت کو یہ مراسلہ بھجوادیا۔ میں اپنی تمام اسلامی خدمات کے باوجود اس اسلامی سربراہ کانفرنس میں مدعو نہ تھا اور میری اسلامی خدمات کو نظر انداز کیا گیا۔ میرے اس مراسلے کا جواب مصر کے عالی مرتبت صدر انور سادات نے دیا۔ ان کو میری پیش رفت سے اتفاق تھا۔

میرے اس مراسلے کے بعد ہی مختلف انجمنوں کو اس کا خیال آیا۔ بعض انگلستان کی انجمنیں اس خیال کو لے اڑیں، حتیٰ کہ ایک انجمن کے ایک فردِ وحید کو عین اس وقت القا ہوا کہ جب وہ مکۃ المکرّمہ سے مدینہ منوّرہ جا رہے تھے۔ اس کا جواب پروفیسر فاطمی صاحب نے اخبار ڈان میں دیا تھا کہ یہ فکر حکیم محمد سعید کی ہے۔ اس کے بعد جب پاکستان میں ایک نیشنل ہجرہ کاؤنسل بن گئی تو اس کے اولین اجلاس کی روداد میں یہ اعتراف موجود

ہے کہ یہ تحریک حکیم محمد سعید نے سب سے پہلے پیش کی تھی اور میں یہ یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ فروری ۱۹۷۴ء سے قبل اس موضوع پر کسی نے کوئی بات نہیں سوچی تھی، یا کہی تھی، یا چھپوائی تھی۔ اس موضوع پر اسلامی سکرٹری ایٹ (جدہ) کی درخواست پر میں نے ہی ایک لائحہ عمل مرتب کیا تھا اور یہ لائحہ عمل دنیا کے ہر ملک کی اہم شخصیات کو میں نے ہی بھجوایا تھا۔

اسلامی سکرٹری ایٹ کا عدم اعتراف

آج صبح کانفرنس میں اسلامی سکرٹری ایٹ کے اسسٹنٹ سکریٹری جنرل جناب محترم ظفرالاسلام صاحب نے جب سکریٹری جنرل جناب حبیب شطی صاحب کا پیغام پڑھ کر سنایا تو اس تقریر میں پاکستان کا کوئی ذکر نہ تھا۔ انھوں نے پوری طرح جاننے کے باوجود اوّلین کنگرس عالمی سیرت النبی ﷺ پاکستان کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ انھوں نے ۱۵ ویں صدی ہجری کی تقریبات کے ذیل میں پاکستان سے ہونے والی تحریک کا بھی کوئی ذکر نہیں کیا۔ انھوں نے ۱۳۹۵ ہجری جدّہ اور ۱۳۹۶ ہجری استنبول میں اسلامی وزرائے خارجہ کے غور اور فیصلوں کا ذکر کیا، مگر ۱۳۹۶ ہجری میں پاکستان سے اس تحریک کے اجرا کا کوئی حوالہ نہیں دیا۔

اس میں ذرّہ برابر شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ یہ دونوں تحریکیں آج عالمی تحریکوں کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ایک کا مقصد یہ ہے کہ ہمارے لیے، عالمِ عرب و اسلام کے لیے، ذاتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نمونۂ عمل ہے، اور دوسرے کا مقصد یہ ہے کہ جائزۂ ماضی لے کر آنے والی صدی کے لیے

ایک ایسا لائحہ عمل مرتب کیا جائے کہ جو سارے عالم کو اسلام کے آغوش میں لے لے اور اس میں بھی ذرّہ برابر شک و شبہ نہیں ہے کہ ان دونوں تحریکوں کی ابتدا پاکستان سے ہوئی ہے، ہمدرد سے ہوئی اور اللہ تعالیٰ کے اس عبد اور بندہ حقیر حکیم محمد سعید سے ہوئی ہے۔

میں اپنے ضمیر کی گہرائیوں میں متلاشی تھا کہ موجودہ صورتِ حال کیوں ہے کہ پاکستان کو ان تحریکوں کا منبع و مخرج نہیں تسلیم کیا جارہا ہے۔

آج کانفرنس کے اجلاس سہ پہر میں شرکت کے لیے پہنچ گیا۔ **فندق الخلیج** کے عظیم الشان لاؤنج میں سب سے پہلے ملاقات محترمی ڈاکٹر عزالدین ابراہیم صاحب، سے ہوئی۔ ڈاکٹر عزالدین ابراہیم ابو ظبی میں جناب شیخ کے ثقافتی امور میں مشیر ہیں اور انتہائی مقبول شخصیت ہیں۔ ان کی یہ مقبولیتِ عامّہ ان کے ذاتی علم و فضل کی بنا پر ہے اور اس بنا پر ہے کہ وہ علم و عالم کے قدر داں ہیں۔ ان کے اس مقام کی شہرت مقامی نہیں ہے، بین الاقوامی ہے۔

ڈاکٹر عزالدین ابراہیم صاحب کو میں نے پاکستان میں اوّلین کنگرس عالمی سیرت نبوی ﷺ میں شرکت کی دعوت دی تھی، مگر وہ شریک نہیں ہوسکے تھے۔ میری ان سے پہلی ملاقات ۱۹۷۷ء میں ہوئی جب کہ وہ "اسلام اینڈ دی ویسٹ پروگرام" میں شرکت کے لیے وینس (اٹلی) آئے تھے۔ یہ ایک اہم پروگرام ہے جس کی بنیاد ہم نے وینس میں ڈالی تھی اور اب ۴ ر اکتوبر ۱۹۷۹ء کو جنیوا میں اس کے لیے لائحہ عمل بن گیا ہے۔ میں نے اس پروگرام میں منصوبہ بندی کی خدمات انجام دی ہیں۔

ڈاکٹر عزالدین ابراہیم صاحب نے آج ملاقات پر فرمایا:

"آج یہاں جو کچھ ہورہا ہے، اس کی ابتدا آپ نے پاکستان میں کی تھی، کیا آپ اپنے ساتھ اس سلسلے کے کچھ کاغذات لائے ہیں؟ میں چاہتا ہوں کہ یہاں اس صداقت کو ریکارڈ کرادوں۔"

میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور ان سے کہا کہ میں اپنے ساتھ ایسی کوئی چیز نہیں لایا ہوں، البتّہ میں نے پاکستان میں ملک شام کے سفیر اور اپنے پیارے دوست ڈاکٹر عمر بہا الامیری صاحب کو تمام معلومات فراہم کردی تھیں جن کے بارے میں معلوم ہوا تھا کہ دوحہ کنگرس سیرت سوم میں مشیر کی حیثیت سے کام کریں گے۔ میں نے ڈاکٹر عزالدین ابراہیم کا شکریہ ادا کیا اور ان کی عظمت کو ایک بار پھر آج میں نے محسوس کیا کہ صداقت اور میری خدمت کو تسلیم کرنے کا خیال آخر ان ہی کے دل میں بیدار ہوا۔ میں ڈاکٹر عزالدین ابراہیم صاحب سے باتیں کرکے آگے بڑھ گیا۔ مجھے ڈاکٹر عبدالرؤف صاحب ملے۔ ڈاکٹر عزالدین ابراہیم کو میں نے ہمیشہ کوٹ پتلون میں دیکھا تھا، آج وہ عرب لباس میں تھے، پہچاننے میں دقت ہوئی۔ انھوں نے خود کہا کہ میں آج دوسرے بھیس میں ہوں، ذرا غور سے پہچانیے! ڈاکٹر عبدالرؤف شبِ گزشتہ پُرتپاک مل چکے تھے، مگر میں نے ان کو رات نہیں پہچانا تھا۔ وہ آج بھی عرب لباس میں ہیں۔ میں نے ان کو اس وقت پہچان لیا، اور اعتراف کیا کہ شبِ گزشتہ ذہن منتقل نہیں ہوا تھا۔

ڈاکٹر عبدالرؤف واشنگٹن میں مرکز اسلامی کے پُرجوش ڈائریکٹر ہیں۔ وہ میری دعوت پر پاکستان اوّلین کنگرس عالمی سیرتِ نبوی ﷺ میں شرکت

کر چکے ہیں۔ ان سے میری ملاقات قدیم ہے۔ گزشتہ مئی میں (۱۹۷۹ء) میں واشنگٹن گیا تھا جہاں مجھے اسلامی سکرٹری ایٹ کی طرف سے امریکی پروگرام برائے ۱۵ ویں صدی ہجرہ جائزہ لینا تھا اور جس کے لیے میں نے چار دن صَرف کیے۔ ڈاکٹر عبدالرؤف صاحب نے تمام میٹنگوں کا انتظام کیا تھا اور میں نے ایک بڑی جامع رپورٹ تیار کرکے اسلامی سکرٹری ایٹ جدّہ کو دے دی تھی۔

ملاقات پر ڈاکٹر عبدالرؤف نے فرمایا:

"حکیم صاحب' آپ نے اس کی ابتدا کی تھی پاکستان میں۔
یقیناً آپ اپنی اس تحریک کی کامیابی پر خوش ہوں گے۔"

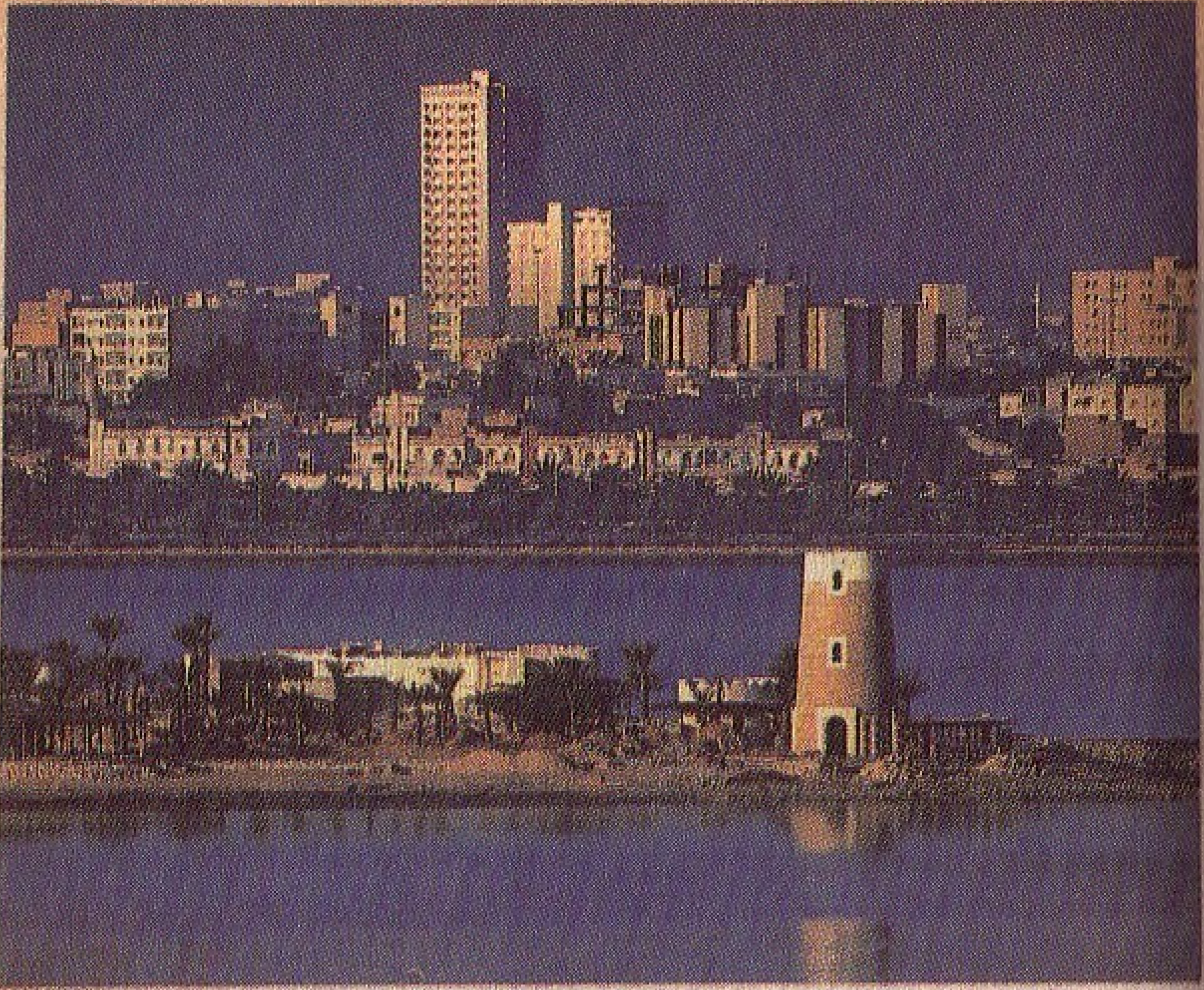
یہ کہہ کر انھوں نے ایک حدیث شریف سنائی:

"مَن سَنَّ سُنَّۃ حَسَنَۃ فَلَہٗ اَجرُھا وَ اَجرُ مَن عَمِلَ بِھَا اِلیٰ یَومَ القِیَامَۃ"

پروفیسر حبیب ندوی صاحب نے اس کا ترجمہ مجھے یہ لکھ کر دیا ہے:

"کسی نیک کام یا اچھے طریق کی بِنا ڈالنے والا خود اپنے اس عمل کے ساتھ تاقیامت اس نیکی پر عمل کرنے والوں کا اجر بھی پاتا رہے گا۔"

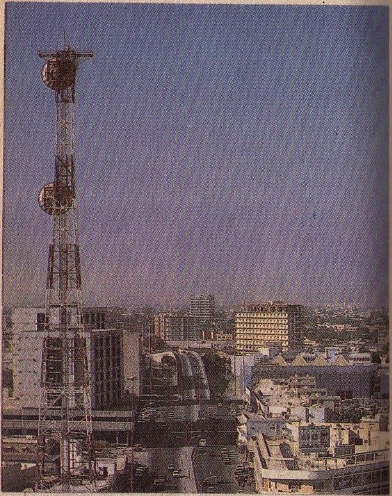
میرے دل و دماغ میں آج صبح سے بڑی شدید کشمکش تھی۔ میرے دل و دماغ شاکی تھے اس صورتِ حال پر کہ صداقت کو چھپایا جارہا ہے اور حقائق کا اعتراف نہیں کیا جارہا ہے۔ ایک طرف دل و دماغ اس صورتِ حال سے متاثر تھے مگر ساتھ ہی تشکّر کے جذباتِ صادقہ سے بھی میرا دل مملو تھا۔ میں



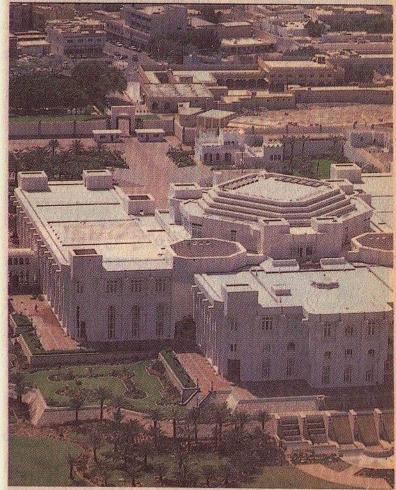
دوحہ کا ایک منظر



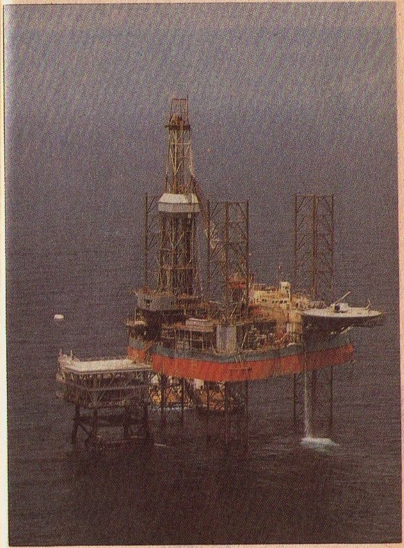
قلعہ الزبارہ



دوحہ کا ایک منظر



امیری دیوان۔ امیر قطر کا دفتر



شمال میں قدرتی گیس کے لیے کھدائی کا پلیٹ فارم

اللہ تعالیٰ کا شکر گزار تھا کہ جس تحریک کی میں نے بنیاد ڈالی' وہ آج عالمگیر حیثیت رکھتی ہے۔ آج کے "گلف ٹائمز" میں اس تیسری سیرت کنگرس عالمی کے بارے میں جو خبر شائع ہوئی ہے اس میں یہ لکھا ہے کہ دوحہ میں اس سے قبل اتنی بڑی کنگرس نہیں ہوئی۔ میرے دل و دماغ میں ایک ہیجان برپا تھا۔ شکایت و شکر کے ملے جلے جذبات موجزن تھے۔ ڈاکٹر عزالدین ابراہیم صاحب کے اعتراف نے مجھے ذرا سکون بخشا تھا' لیکن ڈاکٹر عبدالرؤف صاحب نے حدیث شریف سنا کر میرے دل و دماغ میں برپا تلاطم کو سکون تامہ بخش دیا۔ میں اپنی جگہ مطمئن ہوگیا۔

نونہالو! پروفیسر حبیب ندوی صاحب جامعہ کراچی میں محترم استاد تھے۔ ان دنوں ساؤتھ افریقہ کی جامعہ ڈربن میں تعلیم دیتے ہیں۔ یہاں وہ افریقہ سے آئے ہیں۔ ان کے ساتھ اسی جامعہ سے ڈاکٹر سلمان صاحب بھی آئے ہیں۔ یہ حضرت محترم مولانا سید سلیمان ندوی صاحب کے بڑے صاحب زادے ہیں۔ جامعہ ڈربن میں استاد ہیں۔ اس حدیث شریف کا ترجمہ اردو کرکے انھوں نے آج مجھ پر احسان کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو خوش رکھے۔

آج ڈاکٹر سلمان صاحب کے پاس بیٹھ کر رات کا کھانا کھایا۔ وہ میری ایک خدمت کے لیے ممنون تھے کہ جو میں نے جناب محترم فاضل اجل مولانا صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب مدیر "معارف" (اعظم گڑھ) کے توجہ دلانے پر ان کے خاندان کے لیے کی ہے۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

نونہالو! برِصغیر کی معروف شخصیت ہیں' اور دنیائے عرب میں ایک

مقبول عالم۔ میں نے فخر و مسرت کے ساتھ دیکھا کہ آج یہ ان پانچ شخصیتوں میں سے ایک تھے کہ جو سوم کنگرس عالمی سیرت نبوی ﷺ کے افتتاح کے وقت مقام بلند پر تشریف فرما تھے اور جنھوں نے کنگرس سے خطاب فرمایا تھا۔

افتتاحی خطاب عالی مرتبت امیر قطر ہز ہائی نس شیخ خلیفہ بن حمد الثانی کا متوقع تھا مگر وہ شاید قطر سے باہر ہیں۔ ان کی جگہ ولی عہد بہادر نے مقالہ افتتاحیہ پیش کیا۔ فوری تبدیلی کی وجہ سے ولی عہد صاحب نے خطبہ دینے سے قبل شاید پڑھا نہیں تھا۔ مجھے آج ہی محترمی و مکرمی ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب بڑے یاد آئے۔ ان کا مشورہ یہ ہوا کرتا تھا کہ تقریر کسی بھی زبان میں ہو، حتیٰ کہ اپنی زبان اردو میں بھی ہو، مگر ضروری ہے کہ تقریر کرنے سے قبل کم از کم ایک دو بار اس کو پڑھ لیا جائے۔ ایسا کر کے انسان غلطی نہیں کرتا اور اس کی زبان کے عیوب چھپ جاتے ہیں!

مولانا ابوالحسن الندوی۔ سکرٹری جنرل انڈین ایسو سی ایشن آف علماء
ہز ایکسی لنسی شیخ عبداللہ بن زید المحمود (چیرمین اسلامک کورٹس)
شیخ عبداللہ الانصاری۔ سکریٹری جنرل اسلامی سکریٹری ایٹ جدہ

ڈاکٹر عبدالکریم گابا کا یہاں کوئی ذکر نہیں آیا۔ وہ ۳۱ ر دسمبر ۱۹۷۹ء تک سکریٹری جنرل ہیں، مگر محترمی جناب ظفرالاسلام صاحب نے سکریٹری جنرل کا پیغام عربی زبان میں ہونے والے سکریٹری جنرل جناب محترم حبیب شطی صاحب کی جانب سے پڑھا۔ میری سمجھ میں یہ بات نہ آسکی۔

نونہالو! اپنے خطاب میں محترمی مولانا ابوالحسن الندوی صاحب نے پورے کنگرس کو گرما دیا۔ انھوں نے اپنی فصیح و بلیغ عربی سے لوگوں کو،

اور بالخصوص عربوں کو متاثر کیا، لیکن اس سے زیادہ یہ کہ انھوں نے حقائق کو بلا تامل بیان کر دیا۔ کوتاہیوں کی نشان دہی کر دی اور صراط مستقیم کی جانب بڑی جرأت و ہمت کے ساتھ رہنمائی کر دی۔ وہ شاید آدھے گھنٹے سے زیادہ جوش و خروش کے ساتھ خطاب فرماتے رہے اور کنگرس میں ہر شریک مسرور تھا۔

مولانا ندوی صاحب محترم نے بڑی صفائی کے ساتھ کہا کہ اوّلین کنگرس عالمی سیرت نبوی ﷺ کا انعقاد پاکستان میں ہوا تھا۔ دوسری کنگرس ترکی میں ہوئی، اور اب یہ تیسری کنگرس کا فخر دوحہ کو حاصل ہو رہا ہے۔ یہ پہلا اعتراف تھا۔ اس کے بعد جب سوم کنگرس میں منتظم اعلا جناب شیخ عبداللہ الانصاری صاحب نے تقریر کی تو انھوں نے بھی پاکستان کا اعتراف کیا، مگر مولانا ندوی صاحب کے واشگاف اعتراف کے بعد شیخ الانصاری کے لیے یہ اقرار نہ کرنا ممکن نہ تھا۔

مجھے یہ اطمینان ہو گیا تھا کہ سوم کنگرس کے سامنے حقائق آگئے ہیں۔

اہلِ قطر عظیم ہیں!

اس میں ذرا بھی اشکال نہیں ہے اور نہ مبالغہ کہ سوم کنگرس عالمی سیرت و سنّت نبوی ﷺ ایک بڑی منظم کنگرس ہے، اور اس کنگرس نے حُسنِ معاملہ اور حُسنِ سلوک کے باب میں کم از کم پاکستان کی کنگرس کو مات دے دی ہے۔ مجھے سب سے زیادہ جس چیز نے متاثر کیا ہے وہ اہلِ قطر کا اور پھر کنگرس کے منتظمین کا خلوص ہے اور اللہ پر یقین محکم اور حضرت محمد ﷺ کے رسول اللہ ہونے پر ایمانِ کامل۔ اس یقین و ایقان سے ان

کے دل گرم ہیں اور یہ گرمی یقین و ایمان ان کو اخلاق اور اخلاص عطا کر رہی ہے۔ مجھے اہلِ قطر سے ایک قسم کی محبت ہوگئی ہے۔ میں آج سے تین سال قبل بھی "تاریخِ خلیج" کانگرس میں یہاں مہمان امیر رہ چکا ہوں۔ ان کی میزبانی کا یہ دوسرا تجربہ ہے، اور بڑا شیریں تجربہ ہے۔ حکومت قطر نے ہر شریک کانگرس کے لیے اپنے دل پوری وسعت کے ساتھ کھول دیے ہیں۔ سب سے زیادہ مسرّت ان تحائف کو دیکھ کر ہوئی کہ جو ہمارے آنے سے قبل ہر کمرے میں موجود تھے اور یہ اسلامیات پر کتابیں ہیں۔ قرآنِ کریم ہے، سیرت پاک ﷺ پر کتبِ جلیلہ ہیں اور اس سامان کو ساتھ لے جانے کے لیے ایک سوٹ کیس بھی ساتھ دیا گیا ہے۔ تحائف سے قطع نظر کانگرس کا پروگرام شرح و بسط کے ساتھ ایک نہایت قیمتی کانگرس بیگ میں دیا گیا ہے جو حسنِ انتظام اور حسنِ سلیقہ سے عبارت ہے۔ میں ان حضرات کی انتظامی صلاحیتوں کا تجربہ ماضی کا رکھتا ہوں اور میں جانتا ہوں کہ اس کانگرس میں ان کا حسنِ کارکردگی پہلے سے بہتر ہوگا۔ آج تمام دن کے تاثرات میرے یہی ہیں جن کو میں نے بلاکم و کاست آج ہی لکھ دیا ہے۔

آج شام کے سیشن کے بعد بس مجھے یہ تشویش ہے کہ کانگرس کا علمی مرتبہ کہیں کم نہ ہوجائے، مگر توقع ہے کہ شرکاء اپنے فرائض کی ادائی میں کوتاہی نہیں کریں گے اور اس کانگرس میں ایک لائحہ عمل مرتّب کرکے ہی اٹھیں گے۔

میں نے ایک جملہ یہ لکھا ہے کہ حسن معاملہ اور حسنِ سلوک کے بارے میں دوحہ کانگرس کا مرتبہ پاکستان کانگرس سے اچھا ہے۔ یہ جملہ میں نے

خالصاً اپنے معاملے میں لکھا ہے اور اس جملے کا رخ کسی طرح بھی وزارت مذہبی امور کی جانب نہیں ہے۔ بایں ہمہ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اگر وزارت مذہبی امور کی سیاست پاکستان کانگرس میں داخل نہ ہوتی تو پاکستان کانگرس کا مرتبہ عالی ضرور بلند تر ہوتا جیسا کہ میں نے وزارت مذہبی امور کو "برطرف" کرکے اس مرتبہ علمی کا بہرحال تحفظ کیا تھا۔

نونہالو! آج قصرِ امیر میں ولی عہد نے مندوبین اور مقررین کے اعزاز میں ضیافت کا انتظام کیا تھا۔ یہ بہر اعتبار شاہی ضیافت تھی۔ اعلا انتظامات تھے، اور ہر چیز سلیقے سے تھی۔ اس ضیافت کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں کھانا ذرا بھی ضائع نہیں ہوا۔ مجھے اس کی بڑی خوشی ہے۔

مندوبین کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے کے لیے لاتعداد موٹر کاروں کا انتظام ہے اور مندوبین دنیا کی نئی موٹروں میں سوار ہو کر ادھر اُدھر جا رہے ہیں اور بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ دو مندوب ہی پوری موٹر لے جاتے ہیں۔ آج افتتاح کے بعد ہوٹل آتے وقت ایسا ہی ہوا۔ ایسی صورت میں ایمرجنسی کے طور پر اچھی قسم کی بسیں بھی دو ہیں۔ جناب محترم جسٹس چیمہ صاحب، مولانا محمد تقی عثمانی صاحب اور میں ایک بس میں سوار ہوگئے۔ مگر ایک موٹر آخر میں میسّر آگئی اور منتظمین نے ہماری "شرافت" سے متاثر ہو کر بس سے ہمیں اتارا اور موٹر نشیں بنادیا۔

اس کانگرس میں بہت سے مندوبین وہ بھی ہیں کہ جو اوّل کانگرس پاکستان میں ہمارے مہمان تھے۔ وہ بڑی محبّت سے مل رہے ہیں۔ مجھے بھی ان سے دوبارہ مل کر بڑی مسرّت ہوئی ہے۔

اکثر مقالات کہ جو اس کنگرس سوم میں پیش ہوں گے وہ ہم کو آتے ہی مل چکے ہیں اور کنگرس میں بھی حسبِ ضرورت مل رہے ہیں۔ میرا ارادہ ہے کہ میں ایک اضافی سیٹ بھائی جان محترم کو . . . دہلی بھجوانے کے لیے حاصل کرلوں۔ شاید ایسا ممکن ہوگا۔ مجھے زبان کی وجہ سے دِقّت ہوتی ہے اور اس بار پھر محسوس ہوا کہ مجھے اپنی اس کمی کو دور کرلینا چاہیے۔ میرے پیارے دوست ڈاکٹر عمر بہاالامیری کا مشورہ یہ ہے کہ ان کو اردو سیکھنے کے لیے اور مجھے عربی سیکھنے کے لیے شادی کرلینے پر غور کرلینا چاہیے! اب فرمائیے بڑھاپے میں یہ تجربہ کیسے کیا جائے!

کانفرنس ہال "غرافیہ" میں عربی سے انگریزی ترجمہ کا انتظام تھا۔ مترجمین کو وہ مہارت تو حاصل نہ تھی کہ جو یونیسکو وغیرہ جیسے اداروں کا طرّۂ امتیاز ہے، تاہم مفہوم سمجھنے کی حد تک ترجمہ کا انتظام اچھا تھا۔ مجھے اس سے بڑی مدد ملی۔ آدھی انگریزی اور آدھی عربی سے میں بات کو پوری طرح سمجھ لیتا ہوں۔

قصرِ امیر سے ہوٹل "خلیج" آیا تو ۹ بجے تھے۔ میں نے نماز عشا ادا کرکے لیٹ جانے کا فیصلہ کیا تا کہ نیند پوری ہوجائے اور میں صبح آرام سے چار بجے اٹھ سکوں، اس لیے بھی کہ نماز فجر کا وقت یہاں صبح ساڑھے چار بجے ہے۔

۲۶ر نومبر ۱۹۷۹ء پیر

دوحہ

میں صبح ۸ بجے وقت مقررہ پر ہوٹل اوسس (فندق الراحہ) پہنچ گیا۔ عبداللہ بن عبّاس ہال میں کوئی نہ تھا۔ اس ہوٹل میں چار ہال ہیں اور ان چاروں میں چاروں کمیٹیوں کے اجلاس ہورہے ہیں۔ شان کے لحاظ سے یہ ہوٹل بھی خلیج ہوٹل سے کم درجہ کا نہیں ہے۔ ہر ہر چیز سے شاہی اثرات نمایاں ہیں۔ بارے ساڑھے آٹھ بجے لوگ آئے اور کارروائی شروع ہوگئی، مگر ساڑھے نو بجے ہی یہ اعلان ہوا کہ کمیشن کے ارکان کو جناب نائب امیر کی خدمت میں حاضر ہونا ہے اور دس بجے یہ سیشن وقت مقررہ سے تین گھنٹے قبل ہی ختم ہوگیا۔ میں اپنے ہوٹل واپس آگیا۔

سہ پہر کا اجلاس چار بجے شروع ہوا، مگر ساڑھے پانچ بجے ختم ہوگیا اس لیے کہ ٦ بجے دوحہ کے قاضی القضاۃ کی جانب سے عشائیہ فندق الخلیج ہی میں ہے۔ اوسس ہوٹل سے یہاں آئے تو ڈنر تیار تھا۔ خیر میں نے دن کو بس پھل ہی پر گزارا کرلیا تھا اس لیے اس قبل از وقت ڈنر سے مجھے تو کوئی تکلیف نہ ہوئی۔

منتظمین میں سے ایک صاحب آگے بڑھے کہ "ہیڈ ٹیبل" پر آپ کا نام ہے، آپ وہاں جائیے۔ مجھے تأمل تھا مگر میں چلا گیا۔ وہاں جو منتظم تھے انھوں نے حکم دیا کہ آپ سامنے جائیے، یعنی عوام میں! میں اپنے عوام میں آگیا۔ میں خود بھی کوئی امتیاز نہیں پسند کرتا اور علما کی صحبت میں رہنا پسند کرتا ہوں، مگر مجھے اس بے انتظامی اور سلوک سے ذہنی تکلیف ہوئی جسے ڈاکٹر عبدالرؤف صاحب (مرکز اسلامی، واشنگٹن کے ڈائریکٹر) کی پُرلطف صحبت نے رفع کردیا۔ انھوں نے انڈونیشیا کے بزرگ مندوب سے ملایا جنھوں نے

ہزار کے قریب کتابیں لکھی ہیں! ان سے مل کر میرے ذہن میں سب سے پہلی چیز یہ آئی کہ ہیڈ ٹیبل پر بٹھائے جانے کے اہل درحقیقت یہ مینار علم ہیں۔

میں نے یہاں اچانک ہونے والے امتیاز کو بُرا محسوس کیا ہے۔ اب "بڑوں" کے لیے موٹریں مخصوص کردی گئی ہیں۔ اس کنگرس میں کئی وزیر بھی ہیں۔ ان کے لیے موٹریں مختص کردی گئی ہیں۔ میرے لیے کوئی ایسا انتظام نہیں ہے۔ مگر میں نے اپنے لیے اس امتیاز کو پسند کیا ہے۔ اچھا ہے کہ میں پردۂ اخفا میں رہوں۔ مجھے اس سے ذہنی طور پر کوئی پریشانی اور تکلیف نہیں ہے۔

جن "بڑوں" کے احترام میں ان کے خصوصی لیکچرز رکھے گئے تھے وہ نہیں آسکے ہیں۔ ان کی جگہ اب علمائے حق لے رہے ہیں۔ آج لیکچر میرے دوست ڈاکٹر فواد سیزگین نے کسی وزیر کی جگہ دیا ہے۔ بڑا ہی اچھا ہوا ہے۔ ڈاکٹر فواد سیزگین استنبول کے ہیں، مگر جرمنی کو انھوں نے اپنا وطن بنایا ہے۔ آج ان کے بارے میں معلوم ہوا کہ ان کو فیصل انعام بھی ملا ہے۔ فواد سیزگین علوم سائنس کا ایک انسائی کلوپیڈیا مرتّب کررہے ہیں جو اسلامی سائنس کے احوال پر محیط ہے۔ اس کی سات جلدیں شائع ہوچکی ہیں اور دو زیر طبع ہیں۔ کوئی سات آٹھ برس ہوئے فواد سیزگین صاحب نے خواہش ظاہر کی تھی کہ میں ان کے لیے انڈیا کا مطالعاتی سفر مرتب کردوں۔ میں نے بھائی جان محترم جناب حکیم حاجی عبدالحمید صاحب سے درخواست کرکے رام پور، پٹنہ وغیرہ کی لائبریریوں کے دورہ کا انتظام کرادیا تھا۔

آج ان کا لیکچر علومِ سائنس کی تاریخ پر تھا اور سبق اس کا یہ تھا کہ مسلمانوں کو اپنے ماضی میں جانا چاہیے کہ ان کا علم ماضی بڑا اہم ہے۔

۲۷ر نومبر۱۹۷۹ء منگل

دوحہ

نونہالو! صبح چار بجے اٹھ گیا۔ ہوٹل کے برابر شاید دو مسجدیں ہیں، ان کے میناروں میں فجر کی اذان بڑی بھلی معلوم ہوئی ہے۔ کل رات یہ اطلاع ملی تھی کہ مکتہ المکرّمہ میں مسجدِ حرام کے مینار، باغیوں اور مسجد پر قابضین پر حملوں کے دوران شکستہ ہوگئے ہیں۔ میں کعبتہ اللہ کے میناروں کا تصور کرسکتا ہوں اور ان کی شکستگی سے بڑا ہی دل شکستہ ہوں۔ اس عالم دل شکستگی میں کل پاکستان انٹرنیشنل ایرلائنز کے طیارہ کے حادثے نے بے حد پریشان کردیا ہے۔ اس جہاز میں ۱۵۱ سوار مسافر سب کے سب اللہ کے پیارے ہوگئے ہیں۔ یہ جہاز جدہ سے پرواز کرکے کراچی جارہا تھا کہ طائف اور ریاض کے دوران اس میں آگ لگ گئی اور یہ بدقسمت جہاز پہاڑوں پر گر پڑا اور کوئی تین میل کے اندر بکھر گیا ہے۔ آج صبح کی خبر یہ ہے کہ کوئی بھی ان میں زندہ نہیں بچا ہے اور کسی کی لاش پہچانی نہیں جاتی اس لیے حکومت پاکستان کی اجازت سے ان سب کو طائف میں دفن کیا جارہا ہے۔

کل میں بے حد پریشان رہا۔ کہیں میرے خاندان کے افراد تو اس جہاز میں نہیں تھے، مگر میں نے اپنے دل کو سمجھایا ہے جو بھی تھے پاکستانی تھے، مسلمان تھے، میرے بھائی تھے اور میرے خاندان ہی کے تھے۔ پاکستان ایک بڑا گھر ہے اور اس کا ہر فرد آپس میں عزیز ہے۔

۸ بجے میں کانفرنس ہال میں پہنچ گیا۔ ہال خالی تھا۔ ساڑھے آٹھ بجے تک لوگ جمع ہوئے اور کارروائی کا آغاز ہوا۔ مگر ۱۰ بجے جلسہ برخاست کردیا گیا کہ اب جو مقالات ہیں ان سے نکات حاصل کرکے تجاویز کل صبح سنادی جائیں گی۔ بڑی عجیب بات معلوم ہوئی۔ شب گزشتہ محترمی میاں محمد طفیل صاحب سے بات کررہا تھا۔ ان کے تاثرات وہی ہیں کہ جو میرے ہیں کہ کام کی باتیں نہیں ہورہی ہیں۔

السید یوسف ہاشم الرفاہی صاحب

میں نے ان سے تبادلِ خیال کیا تھا۔ میں نے ان سے کہا کہ یہ جو تجاویز تیار ہو ہوکر تقسیم کی جارہی ہیں فرمایئے ان کا کیا فائدہ ہے؟ ان پر عمل کون کیسے کرے گا؟ جب تک کوئی قوت نافذ نہ ہو اس سے کیا حاصل ہوگا؟ میں نے ان کو بتایا کہ سعودی عرب میں مسجد کانفرنس اور تعلیم کانفرنس کی تجاویز پر فرمایئے کہاں عمل ہوا ہے؟ میں نے کویت کے اس پُرجوش انسان سے کہا کہ تجویز یہ پیش کی جائے کہ ایک قوتِ نافذہ معرضِ وجود میں لائی جائے اور سوم کنگرس عالمی سیرت نبوی ﷺ اس کا فیصلہ کرے ورنہ یہ سب ہنگامہ آرائی ہے اور اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔

ہاشم الرفاہی صاحب نے میری رائے سے اتفاق کیا اور ان کی قوتِ فکروعمل نے میرے حوالے سے آج بھری مجلس میں صاف صاف یہ باتیں کہہ ڈالیں۔ مجھے بڑا اطمینان ہوا کہ صحیح بات بڑی بے باکی کے ساتھ انھوں نے کہہ دی۔ میں نے ان کو مشورہ دیا ہے کہ اس جلسے میں جہاں یہ تجاویز منظور ہوں گی وہ اپنی اس تجویز پر پورا پورا زور صَرف کردیں۔

طب کا ذکرِ خیر

میں نے آج یہ فیصلہ کیا کہ مجھے کسی دوسرے شعبے میں بھی آج جانا چاہیے۔ چنانچہ میں بڑے ہال میں گیا۔ وہاں کویت کے مشیر ڈاکٹر کمال عصری تقریر کررہے تھے اور وہ طب کا ذکر کررہے تھے۔ طبِ یونانی، طبِ اسلامی کا ذکر! ان کی رائے یہ تھی کہ ہمیں مغربی دوا سازوں کی برتری اور حکومت سے دامن چھڑانا چاہیے۔ کویت کے وزیراوقاف صاحب نے بھی اس کی تائید کی۔ ظاہر ہے کہ یہاں قدرت ہی مجھے لائی ہے۔ طب کا ذکر بھی میرے سامنے ہونا تھا۔ میں نے بھی تائید کی۔ ڈاکٹر کمال صاحب سے میں نے بات کی۔ انھوں نے بتایا کہ وہ کراچی میں ۱۹۷۴ء میں مجھ سے مل چکے ہیں۔ مجھے یاد نہ تھا۔ مجھے بڑا اطمینان ہوا کہ کویت میں طب کے لیے اب زمین بالکل ہموار ہے۔

گھُڑدوڑ

نونہالو! اب تک تم نے نہایت سنجیدہ حالات سنے ہیں۔ آؤ، اب میں تم کو گھڑ دوڑ میں لے چلتا ہوں۔ دیکھیں کہ یہاں کیا ہورہا ہے:

آج کے پروگرام میں واقعی ایک دل چسپ پروگرام گھُڑدوڑ ہے۔

بہت سے شرکا تو کانوں پر ہاتھ رکھ کر دست بردار ہوئے اور دید سے محروم رہے۔ ایک بزرگ سے میں نے باادب کہا کہ علامہ آیت اللہ روح اللہ خمینی صاحب نے گھُڑدوڑ اور اس میں شرط لگانے کو جائز قرار دے دیا ہے۔ اب آپ کو کیا تامّل ہے! وہ بزرگ مسکرا کر خاموش ہوگئے۔ اس ایک مسکراہٹ میں ایک قیامت پوشیدہ تھی! مولانا سعید اکبر آبادی، ڈاکٹر سلمان ندوی، ڈاکٹر

حبیب ندوی اور میں، ہم چاروں نے ایک گروپ بنایا اور نمازِ عصر باجماعت ادا کی۔ امامت مولانا ڈاکٹر مصطفیٰ اعظمی صاحب نے کی کہ جو جامعہ ریاض میں استاد ہیں۔ ہم نے موٹر کاروں کی طرف رخ کیا۔ منتظمین کا اختیار ہے، جس کار میں بٹھادیں۔ موٹر کاروں کی کوئی کمی نہیں ہے، ایک سے ایک نئے ماڈل کی گاڑی ہے۔ وزرا کی کاروں کے ساتھ پولیس کار سائرن بجاتی آگے جاتی ہے اور وزرا گردن اکڑا کر کبھی اِدھر دیکھتے ہیں اور کبھی اُدھر۔ سپاہی ان کو سلیوٹ مارتے ہیں، منتظمین ان کو ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں۔ پاکستان سے اگر کوئی وزیر آجاتا تو اس کی گردن بھی ماشاءاللہ تنی ہی رہتی! نونہالو! میں نے اپنا شمار وزیروں میں کرانے سے بہر حال گریز کیا ہے۔ وزارتِ خارجہ پاکستان نے بڑی عنایت کی کہ سفارۂ پاکستان دوحہ کو لکھ دیا کہ کوئی وزیر پاکستان سے نہیں شرکت کرسکے گا۔ اچھا ہے کہ ان کی کتابوں میں بہ حیثیت وزیر میرا اندراج نہ ہو۔ آخر یہ وزیرِ مملکت ہوتا کیا ہے! کھیت کی گاجر مولی سے زیادہ اس کی حیثیت ہے کیا! ایسے وزیروں کو پاکستان کا سکرٹری بیورو کریسی کی آن میں تہس نہس کرکے ڈال دیتا ہے جس کی داد ہے نہ فریاد۔

بارے ریس کورس ہم پہنچ گئے۔ خوب جگہ ہے۔ شان دار عمارت، بڑا ہی قیمتی امریکا سے درآمد کردہ فرنیچر۔ امریکا کا نہ ہوگا برطانیہ کا ہوگا۔ ایک انڈیا کے مولانا صاحب نے آؤ دیکھا نہ تاؤ سب سے اگلی کرسی پر جاکر براجمان ہوگئے۔ دوسرے ہی لمحے ایک منتظم نے مولانا کو بیک بنی دو گوش اٹھا کر پیچھے کی نشستوں کی جانب روانہ کردیا۔ میں نے دل تھام لیا۔ کل ہی کی تو بات ہے کہ مجھے ایک منتظم نے ہیڈ ٹیبل پر روانہ کردیا اور ہیڈ ٹیبل والے

نے مجھے ٹیل ٹیبل پر بٹھادیا۔ جو چاہیے ان کا حُسنِ کرشمہ ساز کرے۔

نونہالو! پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ کسی محفل میں جاؤ تو سب سے پیچھے خاموش بیٹھ جاؤ۔ اب یہ فیصلہ منتظمین کریں گے کہ وہ تم کو کہاں بٹھائیں۔ خود آگے بڑھنے کی کوشش نہ کرو۔

یہ دَور عالم و علم کی شدید ناقدری کا دَور ہے۔ علم پر افتاد پڑی ہے اور عالم راندۂ درگاہ ہے۔ یہ ناقدریٔ علم و عالم ہی ہے کہ میں نے گزشتہ دنوں بن غازی (لیبیا) میں عراق کے ایک عظیم صحافی (مدیر 'الف با') سے سوال کیا کہ فرمایئے گزشتہ دو صدیوں میں دنیائے عرب نے کون سا ایک عبقری پیدا کیا ہے؟ جس دور میں شیخ سعدی علیہ الرحمتہ تھے ان کی گلستان کے پس منظر میں خرابی بسیار نہ ہوتی تو گلستان عالمِ وجود میں نہ آتی۔ آخر ایک دعوت میں شیخ سعدی نے اپنے چغہ کی آستین کو سالن میں ڈبویا ہی تھا! کیوں ڈبویا تھا؟ ان کو بھی سادگی کے عالم میں عشائیۂ شاہی سے نکالا گیا تھا۔ اور جب وہ چغہ فاخرہ میں ملبوس آئے تو ان کو ہیڈ ٹیبل پر جگہ ملی تھی۔ انھوں نے چغہ کی آستین سالن میں بھگونی شروع کردی۔ لوگ حیران ہوئے، کہ حضرت یہ کیا؟ فرمایا: "یہ عزت اسی چغہ کی وجہ سے یہاں ہوئی ہے۔ ذرا ہی دیر پہلے سادہ کپڑوں میں آیا تھا تو یہاں سے ہٹادیا گیا تھا!"

گھڑ دوڑ سے قبل تلاوت قرآن پاک ہوئی۔ زندگی میں میرے لیے یہ پہلا موقع تھا کہ گھڑ دوڑ کی ابتدا تلاوت قرآنِ حکیم سے ہوئی ہے۔ میں کوئی ایسا پارسا نہیں ہوں کہ انکار کروں کہ میں نے گھڑ دوڑ کے میدان میں کبھی قدم ہی نہ رکھا ہو۔ ہاں، بھائی شعیب صاحب بقیدِ حیات تھے۔ ان کے ساتھ

بارہا ریس کے میدان میں جاتا رہا ہوں۔ امریکا گیا تو ہر ہفتے ان کے ساتھ گھڑ دوڑ میں جانا لازمی تھا۔ ایک بار ان کو آغاخان نے ڈربی میں دعوت دی تھی۔ میں وہاں بھی گیا تھا۔

شعیب صاحب مرحوم گھڑدوڑ کے رسیا تھے۔ ان کی یہ سب سے بڑی تفریح تھی۔ ہفتے کی صبح وہ اخبار کے لیے بے چین رہا کرتے تھے۔ واشنگٹن پوسٹ میں ہفتے کی ریس کی تفصیلات ہوتی تھیں۔ ایک ۸-۱۰ صفحے کا پورا ضمیمہ ہوا کرتا تھا۔ وہ بیٹھ جاتے اور حساب لگانے شروع کردیتے تھے۔ گھڑدوڑ ایک بڑا آرٹ ہے اور فن ہے۔ گھوڑوں کے خاندان پر متعدد کتابیں ہیں۔ ایسی کتابیں کہ حیرت ہو۔ اگر آج کوئی گھوڑا دوڑ میں حصّہ لے رہا ہے تو اس کے خاندان کے حالات کسی کتاب میں ضرور ملیں گے اور پورے خاندان کا رکارڈ بھی ملے گا کہ کب ہارے کیسے جیتے اور کیوں ہارے اور کیوں جیتے۔ گھڑ دوڑ میں گھوڑے کا وزن بھی معنی رکھتا ہے اور جاکی (سوار) کے وزن کی جانچ بھی ہوتی ہے۔ پھر گھوڑے اور سوار کی غذا و دوا بھی اہمیت رکھتی ہے۔ ریس سے پہلے خون کا امتحان بھی ہوسکتا ہے مبادا کوئی محرک سی دوا استعمال کرادی گئی ہو۔ جاکی کی دیانت و امانت بھی مقام رکھتی ہے۔ غرض نہ جانے اور کیا کیا ہوتا ہے۔ میں نے اس سے زیادہ سمجھنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔

بہت سے لوگ جانتے ہیں کہ شعیب صاحب گھڑدوڑ کے رسیا تھے مگر بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ شعیب صاحب نے شرط کو کبھی اہمیت نہیں دی۔ ہارجیت سے ان کو ذرا بھی دل چسپی نہ تھی۔ میں اس کا گواہ ہوں کہ وہ بس ایک ذہین انسان کی طرح حساب لگاتے تھے کہ ریس کون سا گھوڑا جیتے گا۔

انھوں نے معمولی ٹکٹ کے علاوہ کبھی کوئی ٹکٹ نہیں خریدا۔ ہارجیت بھی چند ڈالروں کی حد تک رہتی تھی۔ جتنا وہ ریس میں جیتتے تھے اس سے زیادہ ریس کے میدان میں خاطر تواضع میں خرچ کردیا کرتے تھے۔

میں بارہا شعیب صاحب کے ساتھ امریکا کی گھڑدوڑوں میں گیا ہوں مجھے انھوں نے امریکا میں ایک بار بھی اجازت نہ دی کہ میں ٹکٹ خریدلوں۔ بارہا ایسا ہوا کہ جس گھوڑے کی میں نے نشان دہی کی وہ واقعی اوّل آیا اور شعیب صاحب کا حساب غلط ہوگیا! سلیمان صاحب کہتے تھے کہ جب آپ کو یہ قدرت حاصل ہے تو پھر آپ ٹکٹ کیوں نہیں لیتے۔ شعیب صاحب کہتے تھے کہ میں اسی لیے سعید میاں کو منع کرتا ہوں!

آخر ایک بار شعیب صاحب رام ہوگئے۔ آغاخاں کی دعوت پر ڈربی میں شعیب صاحب کے ساتھ میں گیا۔ ہاں یہ ڈربی کیا تھی انگریز مرد و عورت کے لباس کی نمائش بھی تھی۔ لمبا سخت ہیٹ اور ٹیل کوٹ ڈربی کے آداب میں شامل ہے۔ عورتیں ایک سے ایک حسین لباس میں۔ ڈربی میں میں نے عورتوں کے ہیٹوں کی جتنی اقسام دیکھیں زندگی میں نہ دیکھی تھیں۔

مجھے انھوں نے ایک "جیک پاٹ" کا ٹکٹ خرید کردے دیا اور میری درخواست پر خود ہی مجھے گھوڑوں کے نام بھردیے۔ یہ جیک پاٹ کیا ہے؟ میں نے شعیب صاحب سے پوچھا۔ انھوں نے بتایا کہ یہ چھے گھوڑوں کی دوڑ ہے۔ جس ترتیب سے آپ نام لکھیں گے اسی ترتیب سے گھوڑے پہنچنے چاہییں۔ ادھر میں نے دیکھا تو بورڈ پر انعام ۴۵ ہزار پاؤنڈ تھا!

میرا دل ایک دم سے اچھلا، جسے شعیب صاحب کی ایک نگاہِ غلط انداز

نے اپنی جگہ پر بحال کردیا۔ ریس شروع ہوئی اور میں اٹینشن ہوگیا۔ تو نہالو! یقین کرو کہ میرے ساتھ معاملہ یہ ہوا کہ جیک پاٹ پر پانچ گھوڑے میرے کارڈ کے مطابق اوّل آگئے۔ اب اگر چھٹا بھی آگیا تو ۴۵ ہزار پاؤنڈ اسٹرلنگ کی رقم تھی جو انعام میں ملے گی!

پانچ کے بعد اب چھٹی اور آخری ریس شروع ہوگئی۔ میں منصوبے بنانے لگا کہ اس ۴۵ ہزار اسٹرلنگ پاؤنڈ سے کون سا رفاہی ادارہ لندن میں قائم کرنا چاہیے۔ میں نے سوچا کہ تاریخ طب و سائنس کے میدان میں کام کرنے کی ضرورت ہے۔ ۴۵ ہزار پاؤنڈ سے ایک ٹرسٹ قائم کرکے یہ کام شروع کردینا ٹھیک ہوگا۔

اتنے میں خیال آیا کہ ٹکٹ کی رقم تو جناب بھائی شعیب صاحب نے دی ہے۔ اگر انھوں نے فرمایا کہ ۴۵ ہزار پاؤنڈ میرے حوالے کردو تو میں خاموش ہی ہوسکتا ہوں۔ دوسرے دل نے کہا کہ نہیں شعیب صاحب ایسا نہیں کرسکتے۔

پھر خیال آیا کہ گھوڑوں کا انتخاب تو شعیب صاحب نے ہی کیا ہے۔ وہ کہہ سکتے ہیں کہ سب کیا دھرا میرا ہے۔ ۴۵ ہزار پاؤنڈ سے تمہارا کیا تعلق؟

ایک خیال یہ بھی آیا کہ ۴۵ ہزار پر انکم ٹیکس اگر لگ گیا تو باقی کیا بچے گا۔ دل میں آیا کہ انکم ٹیکس کا برٹش لا کیا ہے' یہ شعیب صاحب سے جلدی سے پوچھ لوں! ایک ایسا مسئلہ یہ پیدا ہوا کہ انکم ٹیکس ادا کرکے باقی رقم مجھے پاکستان میں اپنی آمدنی میں دکھانی ہوگی اور اس پر وہاں بھی ٹیکس لگے گا!

غرض اتنے کہ چھٹی ریس شروع ہو' نہ جانے میں نے کیا کیا جلدی

سوچ لیا۔ اتنے میں گھنٹی بجی اور تمام جواری اور سیلانی اٹینشن ہوگئے۔ میں آج جواری تھا!

چھٹی ریس ہوئی۔ میرا دل بڑا ہی بے قرار تھا۔ میری بے قراری کو شاید جناب شعیب صاحب نوٹ کررہے تھے۔ گھوڑے اچھلتے تو میں اور میرا دل دونوں اچھلنے لگتے۔ مجھے اپنے پر بڑا ہی غصہ آیا کہ میں ریس میں آیا ہوں اور دوربین نہیں ہے میرے پاس! میں یہ یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ میرے دل کی رفتار گھوڑوں کی رفتار سے کم نہ تھی۔ بالآخر گھوڑے سامنے آئے' اور میں نے دیکھا کہ وہ گھوڑا جسے میری خواہش اور دعا کے مطابق اوّل آنا چاہیے تھا پھسڈی رہ گیا اور میں ہار گیا۔ یعنی نہ ہار نہ جیت۔ ساری تگ و دو بے کار!

جب ذرا مجھے سکونِ قلب حاصل ہوگیا تو بھائی شعیب صاحب متوجہ ہوئے! "سعید میاں! آپ نے دیکھ لیا؟ میں اسی لیے منع کرتا تھا کہ آپ بس سیر کیجیے۔ یہ بڑے دل گردے کا مقام ہے!"

میں نے ندامت سے سر جھکالیا۔

خیر تو آج کی ریس تلاوت قرآن پاک سے شروع ہوئی تھی!

اس ریس کی ایک کتاب بھی تیار تھی۔ اس کا پہلا صفحہ آیات قرآنی سے مزین تھا اور تمام کتاب آج کے پروگراموں سے پُر تھی۔ یہ گھڑ دوڑ درحقیقت وہ ریس نہ تھی جیسی کے عام طور پر مشہور ہے اور جس میں لوگ شرطیں لگا کر کبھی رئیس بن جاتے ہیں اور کبھی مفلس اور قلاش۔

اس گھڑ دوڑ کی حیثیت بس فنّی تھی اور عسکری۔ ریس کے

علاوہ "ہارس جمپ" بھی پروگرام کا ایک جزو تھی۔ گھڑ چھلانگ اور گھڑ دوڑ دونوں میں کم عمر جوان حصہ لے رہے تھے اور دادِ شجاعت دے رہے تھے۔ مثلاً دوڑ اور چھلانگ میں جو اوّل آئے ان کی عمریں ۱۲۔۱۴ سال سے زیادہ نہ تھیں۔ ان کو دیکھ کر مجھے واقعی بڑی خوشی ہوئی۔

چار گھڑ دوڑیں کم اور زیادہ فاصلے کی ہوئیں۔ ایک زمانہ تھا کہ میں بھی گھڑ سواری کرتا تھا اور گھوڑوں سے مجھے بھی محبت تھی۔ خود میرا گھوڑا موتی ایک اچھا گھوڑا تھا اور مجھے یہ آج بھی یاد ہے۔ میرے پاس اس کا فوٹو اب بھی موجود ہے۔ آج میری حس بیدار ہوئی۔ سوال یہ پیدا ہوا کہ چھ میں سے کون سا گھوڑا اوّل آئے گا۔ میں نے بڑے غور سے ہر گھوڑے کو دیکھا اور رائے قائم کردی۔ وہی اوّل آیا! دوسری بار بھی میں نے اپنی رائے دی۔ اس پر جناب ظفرالاسلام صاحب نے فرمایا کہ نمبر سات بالکل آخر میں کوسوں دور تھا۔ تیسری اور چوتھی ریس میں بھی میرے ہی بتائے ہوئے گھوڑے اوّل آئے۔

انعام تو مجھے ملنا چاہیے تھا!

جامع مسجد دوحہ

آج نمازِ مغرب مسجد جامع میں ادا کی۔ قصر مکتب الامیر سے ملحق یہ بڑی خوب صورت مسجد ہے۔ میں قصر میں پہلے جناب امیر سے ملاقات کے لیے آچکا ہوں۔ اس وقت جامع مسجد کو نہیں دیکھا تھا۔ بڑی مسجد ہے' اتنی کہ اندر چار پانچ ہزار آدمی نماز ادا کرلیں۔ ائرکنڈیشنڈ ہے۔ کنگرس کے پروگرام میں آج یہاں محترمی جناب مولانا ابوالحسن علی الندوی صاحب کا خطاب تھا۔

میرا ارادہ تھا کہ میں یہاں ٹھیروں گا' مگر آج ہی سفارت خانہ پاکستان نے ایک استقبالیہ کا انتظام کرلیا ہے اور ہم سب پاکستانی اس میں شریک ہوئے اور مولانا کی تقریر سے محروم ہی رہے۔

پاکستان سے اس سوم کنگرس عالمی سیرت نبوی ﷺ میں حسب ذیل حضرات شریک ہوئے:

محترمی مولانا محمد طفیل صاحب۔ محترمی پروفیسر خورشید احمد۔ محترمی جناب محمد افضل چیمہ صاحب۔ محترمی مولانا محمد تقی عثمانی صاحب۔ محترمی ڈاکٹر انعام اللہ خاں صاحب اور حکیم محمد سعید۔ وزرا مذہبی امور و نشریات و اطلاعات پاکستان شرکت نہ کرسکے۔ نہ ہی حضرت مفتی محمود صاحب تشریف لاسکے۔ یہ بھی مدعو تھے۔

بڑا غنیمت ہے

سفارۃ پاکستان کے لیے پاکستانیوں کی دوحہ آمد بڑی غنیمت ہے۔ رائے یہ ہے کہ کوئی پاکستانی "بڑا" اس علاقے میں قدم نہیں رکھتا اس لیے یہاں کے سفیر کو رابطہ کے لیے بڑی مشکلات کا سامنا ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ شکایت زیادہ غیر صحیح نہیں ہے۔

میں نے یہاں کئی جگہ تبادلِ خیال کیا ہے۔ اس علاقے میں پاکستان کی تجارت نہ ہونے کے برابر ہے۔ اب تو لوگ پاکستان سے تجارت کرتے ہوئے کانوں پر ہاتھ رکھتے ہیں۔ تجربات بڑے تلخ ہیں اور داستانیں بڑی الم ناک ہیں۔ دوحہ کیا' سارے شرق اوسط میں یہ مشہور اور مسلم ہے کہ پاکستان کا تاجر و صنعت کار بد دیانت ہے۔ یہ رائے اب ایسی مستحکم ہوچکی ہے کہ اس

کا توڑ آسان نہیں ہے۔ میں تو شرقِ اوسط میں کافی آتا جاتا ہوں اور گزشتہ دس گیارہ سال سے پاکستان کے بارے میں رائے یہی ہے۔ میں نہیں سمجھ سکا کہ پاکستان کا محکمۂ برآمدات اس صورتِ حال سے ناواقف ہوگا۔ ضرور اس کو معلوم ہوگا، مگر میرے علم کے مطابق اب تک اس باب میں کوئی مثبت اقدامات نہیں ہوئے ہیں۔

پاکستان ایکسپورٹ کے لیے ساری دنیا سے روابط قائم کرتا ہے اور اس کی توجہات ایسے علاقوں کی جانب ہیں کہ جہاں زمین بڑی سخت ہے اور جہاں زمین بڑی نرم تھی وہاں ہم نے اپنی بد دیانتیوں کی وجہ سے اپنے لیے تنگ کرلی ہے۔ حال آں کہ اگر پاکستان صرف شرقِ اوسط ہی میں اپنی پوری توجہات صَرف کردے تو یہ بجائے خود اتنی بڑی منڈیاں ہیں کہ جن پر آج یورپ زندہ ہے اور امریکا سانس لے رہا ہے!

ہماری صنعت و حرفت گزشتہ چھے سات سالوں میں سوشلزم کے تجربات کی نذر ہوگئی ہے۔ "مساوات" کے تجربوں نے یہاں آجر اور اجیر دونوں کو بے راہ کردیا ہے۔ پاکستان کے صنعت کار نے نہ صرف صنعت سے روگردانی کی ہے بلکہ معیاراتِ مصنوعات کی بلندی پر ذرا بھی توجّہ نہیں کی ہے۔ صنعتی پالیسیوں نے اور بیوروکریٹوں کی من مانیوں نے صنعتِ پاکستان کو پژمردہ کردیا ہے۔ دوسری طرف مزدور ہے کہ اب کام کرنے پر آمادہ ہے نہ تیار۔ اس کی توجّہ زیادہ تر اس پر ہے کہ وہ کس طرح صنعت کار کو زک پہنچاسکتا ہے۔ اس کے لیے وہ بُری سے بُری حرکت کرسکتا ہے۔ ہمدرد میں اس کا خود ہمیں بڑا ہی تلخ تجربہ ہوا ہے۔ ہمدرد کا خوش حال اور مرفہ الحال

مزدور کارمینا میں ماہواری کی آمیزش کرکے خوش ہوسکتا ہے اور ڈبے میں خالی شیشی پیک کرکے طمانیت محسوس کرتا ہے۔ ہمدرد میں ایسی بہت سی تکلیف دہ مثالیں ہیں۔ اگر ہمدرد جیسے ہمدرد اور ہمدم ادارے میں ایسا ہوسکتا ہے تو پاکستان کی ہر صنعت اس صورتِ حال کا ضرور شکار ہے۔

پاکستان کی صنعت ایک طرف غلط اور منفی پالیسیوں کا شکار ہے تو دوسری طرف ناقابلِ عمل لیبرپالیسی نے اس کو تباہ کرکے رکھ دیا ہے اور اس صورتِ حال کا کوئی حکومت بھی جائزہ لینے کو تیار نہیں ہے۔ ایک حکومت میں اسلام کے بڑے ٹھیکیدار بھی آئے، مگر ان کو اپنے زمانۂ حکومت میں اسلام کا یہ پہلو ایک دن نظر نہ آیا کہ آجر اور اجیر کے مابین توازن اور عدل کیسے قائم کیا جائے۔ ان کو ووٹ کی ضرورت تھی اس لیے وہ غیر شرعی قانون مابین مزدور و سرمایہ کی اصلاح کے لیے ایک بار بھی زبان نہ کھول سکے۔ آج بھی صورت حال یہی ہے۔

مگر موجودہ صورت حال انتہائی سنگین ہے۔ ہم اب زیادہ عرصہ بھیک اور امداد پر زندہ نہیں رہ سکتے۔ اگر ہم نے اپنی صنعت و حرفت کے میدان میں صحت مند پالیسیاں اختیار نہ کیں اور صنعت و تجارت میں حق و انصاف کو راہ نہ دی اور آجر کے سوءِ مزاج اور اجیر کی بدمزاجی کی اصلاح نہ کی تو پاکستان کی صنعت ڈوب جائے گی اور ہم انتہائی درجے میں معاشی بحران کا شکار ہوجائیں گے جو ہمیں آزادی سے محروم کرسکتا ہے۔ میں اس وقت تک یہ مطالبہ نہیں کرسکتا کہ پاکستان کے محکمۂ برآمدات کو مستعد کرکے شرقِ اوسط میں متحرک بنادیا جائے جب تک صنعتی میدان میں شرعی حالات پیدا نہ

کردیے جائیں۔ موجودہ لیبرلاز قطعی مبنی بر انصاف نہیں ہیں اور ان قوانین کی موجودگی میں مزدور کبھی دیانت وامانت کا دامن نہیں پکڑ سکتا۔ جو لوگ یہ سمجھ رہے ہیں کہ وہ ان ہی قوانین کی موجودگی میں پاکستان کی مردہ صنعت میں جان ڈال دیں گے وہ میری رائے میں احمقوں کی جنّت میں بستے ہیں۔

عشائیہ

کنگرس کی جانب سے آج عشائیہ "المنتزہ" میں تھا۔ بہت اچھی فضا! بیٹھنے کا سارا انتظام قالینوں پر تھا۔ گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے۔ میں سفارۃ پاکستان سے قائم مقام سفیر جناب مظہر صاحب کے ساتھ آیا تھا۔ وہ اپنے حلقے میں چلے گئے اور میں اپنے حلقے میں آگیا!

آج ڈاکٹر عبدالرؤف صاحب (ڈائریکٹر اسلامک سنٹر واشنگٹن، امریکا) سے بڑی تفصیل سے باتیں ہوئیں۔ ان کو میرے بارے میں بہت سی باتیں معلوم ہیں، بعض باتیں میں نے ان کو بتادی ہیں۔

کھانا بہت شان دار تھا اور بہت زیادہ تھا۔ میں کھانے میں سری لنکا کے وزیر صاحب سے اور جناب ظفرالاسلام صاحب سے تبادلِ خیال کرتا رہا۔ سری لنکا نے ۱۴ سو سال کے ذیل میں ایک یادگاری ڈاک ٹکٹ چھاپ دیا ہے اور اب جنوری ۱۹۸۰ء میں وہاں اس موضوع پر ایک عالمی کنگرس ہورہی ہے جس میں شرکت کے لیے انھوں نے مجھے بھی دعوت دی ہے۔ میں نے ان سے کہا کہ اسلامی سکریٹری ایٹ جدّہ کو تو آپ کے ہاں کی کانفرنس کا کوئی علم نہیں ہے۔ معلوم ہوا کہ خط ضائع ہوا ہے۔ بارے جناب ظفرالاسلام صاحب نے فرمایا کہ وہ اب جدّہ جاکر صورتِ حال کا جائزہ لیں گے۔ اس طرح عالمِ

اسلام سے باہر یہ پہلی کانفرنس بہ سلسلہ جشن ۱۵ صدی ہجرہ ہوگی۔

۲۸ر نومبر ۱۹۷۹ء بدھ

دوحہ۔ کراچی

میں نے اپنا سامان رات ہی تیار کرلیا تھا، اور رات ہی پاکستان انٹرنیشنل ائرلائنز کے منیجر صاحب سے مل کر گلف ائرلائنز سے پی۔ آئی۔ اے میں خود کو منتقل کرالیا تھا۔

صبح ۶ بجے سامان نیچے اتار لیا۔ ہوٹل کے خزانچی سے مل لیا اور بل پر دستخط کردیے ہیں۔ حکومتِ قطر نے میری مہمان داری پر تقریباً چار سو امریکی ڈالر خرچ کیے ہیں۔ ساڑھے چھے بجے قائم مقام سفیر پاکستان تشریف لے آئے۔ میں نے ان سے شبِ گزشتہ کہہ دیا تھا کہ وہ ذرا بھی زحمت نہ فرمائیں۔ کنگرس کا انتظام اعلا ہے۔ مجھے ان کے نہ آنے سے تکلیف ہوگی اور نہ شکایت، مگر وہ تشریف لے آئے۔ ساتھ ہی عبدالحمید آفریدی صاحب سکنڈ سکریٹری بھی آگئے۔ سامان میرا پہلے ہی جاچکا تھا۔ مولانا محمد تقی عثمانی صاحب پہلے تشریف لے گئے تھے۔ سامان بڑا ہی وزنی تھا۔ حکومت نے کتابوں کے تحائف بکثرت دیے اور ساتھ ہی کتابوں کے لیے ایک سوٹ کیس بھی دیا۔ رات کو جب میں نے اس کو پیک کیا اور سفارۃ پاکستان سے لائی ہوئی رسی سے جکڑا تو اب یہ اس قدر وزنی تھا کہ میں اس کو اٹھا نہیں سکتا تھا۔ مگر کنگرس نے تمام ائرلائنز سے رابطہ قائم کرکے وزن جو زیادہ تھا اس کو بلاقیمت کرادیا تھا۔

دوحہ کے ہوائی میدان پر کنگرس کے نمائندے بھی تھے۔ آج جو

لوگ قبرص جارہے تھے ان میں مفتیٔ قبرص بھی تھے۔ ان سے میں نے پوچھا کہ حضرت یہ لفظ قبرص ہے یا قبرس؟ عرب لوگ تو قبرس کہہ رہے ہیں۔ انھوں نے فرمایا کہ ترکی لفظ میں قبرص ہی ہے، عرب قبرس کہتے ہیں۔

آج آنے والوں میں ڈاکٹر انعام اللہ خاں صاحب تھے جن کو خصوصیت سے بلایا گیا ہے۔ یہ تو خیر اتفاقی بات ہے، مگر پاکستان کے نمائندے اکثر و بیشتر اجتماع کے یوم اختتام پر پہنچا کرتے ہیں! اس کی عالمی شہرت ہے!

میں ہوائی جہاز میں سوار ہوگیا اور اپنا کام شروع کردیا۔

دو گھنٹے میں کراچی پہنچ گیا اور ہوائی میدان سے سیدھا اپنے دفتر ہمدرد آگیا۔ یہاں میں نے شام کے چھ بجے تک کام کیا۔ آج دونوں کنگرس کے بارے میں تمام کام ختم ہوگئے ہیں۔ اب ہمدرد کے افسر ہفتے کے روز اسلام آباد تمام سامان کے ساتھ روانہ ہوجائیں گے۔

تمام اخبارات میں آج یہ خبر ہے کہ راشد منیر احمد اور ان کی والدہ اسی جہاز سے روانہ ہورہے تھے کہ جو طائف اور ریاض کے درمیان لقمۂ اجل ہوگیا ہے۔ ہوائی میدان پر دو آدمی آئے جن کا ویزا ختم ہورہا تھا۔ اگر وہ زیادہ رہ جاتے تو یقیناً گرفتار ہوجاتے۔ راشد منیر احمد نے ہمدردی سے کام لیا اور اپنی جگہ ان کو دے دی۔ راشد منیر احمد اور ان کی والدہ نے دوسرے دن جگہ لے لی۔

یہ راشد منیر احمد میرے داماد ہیں!

جب میں گھر آیا تو گھر میں بڑی چہل پہل تھی۔ ایک تو حج بیت اللہ کی خوشی اور دوسرے جان بچنے کی خوشی۔ میں بھی ان خوشیوں میں شریک

ہوگیا اور رات تک سب کے ساتھ رہا۔

۱۰ بجے میں نے تھکن محسوس کی اور آرام کے لیے اٹھ گیا۔

تاریخ قطر

نونہالو! تم تو خوب جانتے ہو کہ مجھے تاریخ سے گہری دل چسپی ہے، خصوصاً تاریخ سائنس سے۔ قطر میں تو سائنس کی تاریخ نہیں ہے اس لیے میں تم کو اس نہایت دل چسپ ملک کی تاریخ سناؤں گا۔ اب تم اس کے لیے تیار ہوجاؤ۔

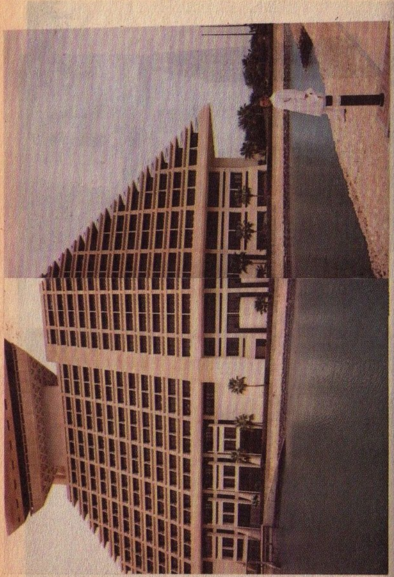
تیسرا باب

میرے عظیم نونہالو!

تم کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ صرف پچاس برس پہلے قطر عرب کے ایک لق و دق صحرا کا منظر پیش کرتا تھا۔ اندرونِ ملک بدّو اونٹ کے دودھ اور کھجوروں پر گزارا کرتے تھے۔ ان کے گھر یا تو اون کے بنے ہوئے خیمے ہوتے تھے یا ساحل پر گھاس پھوس کی جھگیاں جھونپڑیاں! لوگ یا تو صحرا نوردی کرتے یا سمندر کے کنارے کشتی رانی اور ماہی گیری کرتے۔ اب یہ عالم ہے کہ اسی بے آب و گیاہ زمین میں کھاری پانی کو میٹھا پانی بنانے والے کارخانے کروڑوں گیلن میٹھا پانی گھر گھر پہنچا رہے ہیں۔ جہاں کبھی سبزی ترکاری، سبزہ اور پھل نام کو نہ تھے وہاں سبزہ زار، باغات اور مویشیوں کے فارم موجود ہیں۔ جہاں نہ کوئی استاد تھا اور نہ طبیب۔ وہاں کالج یونی ورسٹی اور ہسپتال موجود ہیں۔ سر بہ فلک عمارتیں ہیں، بڑی بڑی چوڑی سڑکیں ہیں، ساحلِ

سمندر پر کئی میل لمبی خیابان ہے، پیٹرو کیمیکلز اور گیس کے کارخانے ہیں، اسٹیل، سیمنٹ اور کھاد کی فیکٹریاں ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ جنوں اور دیوؤں نے یورپ کی زمین کا ایک شان دار ٹکڑا کاٹ کر قطر کے صدر مقام دوحہ میں لاکر رکھ دیا ہے۔

نونہالو! نو آبادیاتی طاقتوں یعنی انگریزوں، فرانسیسیوں، ڈچوں وغیرہ نے اپنے ملکوں سے نکل کر دوسرے ملکوں کو اپنالیا اور ان پر قبضہ جمالیا، ان کی لکھی ہوئی تاریخوں نے ہمیں کئی غلط تاثر دیے تھے: مثلاً یہ کہ افریقہ تاریک براعظم ہے حالانکہ صحرائے اعظم کے علاقے کو چھوڑ کر باقی تمام افریقہ آباد اور شاداب ہے اور قدرتی وسائل سے مالا مال ہے۔ دوسرا غلط تاثر یہ تھا کہ افریقہ کی آبادی جنگلی انسانوں پر مشتمل تھی۔ اب بشریات کا علم یہ بتاتا ہے کہ ہومو اریکٹس (HOMO ERECTUS) یعنی کھڑا ہو کر چلنے والے جدید انسان کی نسل ہی افریقہ سے چلی ہے اور پھر یورپ میں پھیلی ہے۔ اسی انسان نے پہلے پہل آگ اور کلہاڑی کا استعمال کیا تھا۔ جدید انسان کا ارتقا اسی نوع (قسم) سے ہوا ہے۔ ایک تاثر یہ تھا کہ عرب کے لوگ صحرا میں رہنے والے بدّو ہوتے ہیں۔ خیموں میں رہتے ہیں، ایک دوسرے کو قتل و غارت کرتے ہیں۔ اب یہ حقیقت بھی تسلیم کرلی گئی ہے کہ عرب حضرت نوحؑ کے بیٹے سام کی نسل سے ہیں اس لیے سامی کہلاتے ہیں اور اکادی، بابلی، آشوری، فینیقی، بنی اسرائیل اور مسلمان عرب وہ قومیں ہیں جنھوں نے اپنے دور میں سلطنتیں قائم کیں اور انسانی تہذیب کو آگے بڑھایا۔ صرف مسلمان عربوں کی تہذیب پر نظر دوڑاؤ... انھوں نے شہر بسائے، بحری جہاز



ہوٹل دوحہ شیراٹن۔ قطر نے کیسے کیسے یہاں دل کش گرد و دور کار ہے

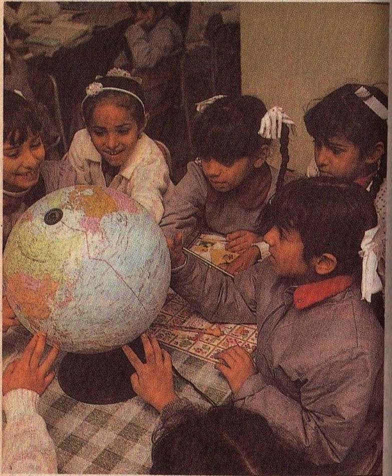
رانی کی، علوم و فنون کو ترقی دی اور انسانی عظمت کے ایسے نقش چھوڑے جو تاریخ تہذیب و تمدّن کے سنہرے باب ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ قطر کے لوگ پچاس برس پہلے غریب اور جاہل تھے، لیکن اس قلیل مدّت میں انھوں نے ترقی کی وہ مثال قائم کردی ہے جو ہم پیش نہیں کرسکے۔ اب میں پہلے اپنے عظیم نونہالوں کو قطر کی تاریخ سناتاہوں۔ پھر اپنی بیتی سناؤں گا۔ ایک ۱۹۷۹ء کی اور دوسری ۱۹۹۴ء کی! ہاں، پہلے ذرا حدودِ اربعہ کو سمجھ لیں۔

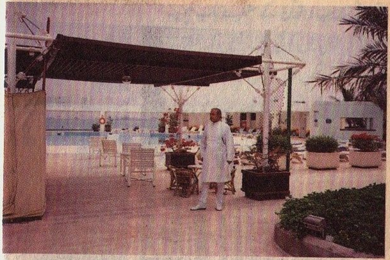
حدودِ اربعہ اور رقبہ

قطر خلیج کے درمیان میں سو، سوا سو میل لمبے جزیرہ نما کی شکل میں واقع ہے۔ اس کا پینڈا دبئی اور سعودی عرب کی سرحد پر واقع ہے۔ اس کا کُل رقبہ ۴۴۶۰ مربع میل (۱۱۴۳۷ مربع کلومیٹر) ہے۔ پینڈے کو چھوڑ کر اس کے تین طرف سمندر ہے۔ اس کا جو سرا سمندر میں واقع ہے وہاں ایک شہر الرولیس آباد ہے۔ وہاں سے مشرقی ساحل کے گِرد جاتے ہوئے فویرت، الخور، دوحہ، الوکرہ اور اُمِّ سعید واقع ہیں۔ عرب ریاست قطر کا صدر مقام دوحہ ہے۔ یہاں ہی بندرگاہ اور ہوائی اڈا ہے۔ اُمِّ سعید بھی بندرگاہ اور صنعتی شہر ہے۔ اب دوبارہ سرے کے شہر الرولیس سے مغربی سال کے گِرد جائیں تو الزبرہ، دخان، اُمِّ باب اور سلوا کے شہر واقع ہیں۔

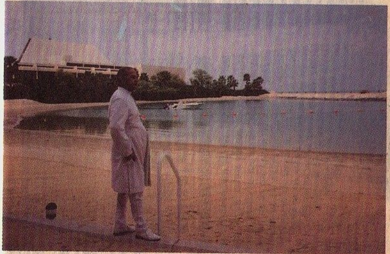
مغربی ساحل پر چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں اور ٹیلوں کو چھوڑ کر پوری زمین ہموار، ریتلی اور بنجر ہے۔ شمال میں تھوڑی سی قدرتی نباتات پائی جاتی ہے۔ گرمیوں میں سخت گرمی پڑتی ہے البتہ موسمِ سرما میں آب و ہوا معتدل ہوتی



نونہال طالب علم



ہوٹل شیراٹن دوحہ میں تیراکی کا علاقہ



ہوٹل دوحہ شیراٹن کے باہر سمندر کا ایک منظر

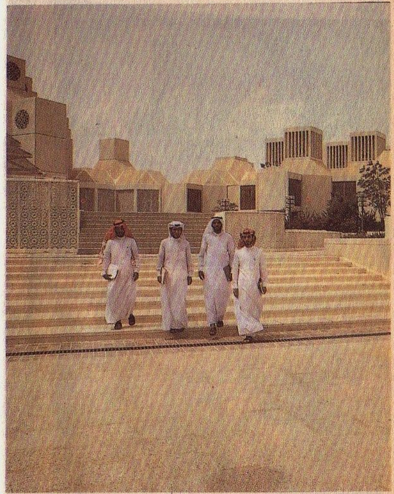
ہے۔ ۵۰ سے ۷۰ ملی میٹر سالانہ بارش ہوتی ہے۔ سال بھر رطوبت زیادہ رہتی ہے۔

قدیم تاریخ

قطر کی تاریخ نہایت قدیم ہے۔ اس تاریخ کو زیادہ اچھی طرح سمجھنے کے لیے میں قطر کے قومی عجائب گھر گیا اور وہاں میں نے نہایت دل چسپی کے ساتھ پتھر کے زمانے کے آثار دیکھے جو نمائش کے لیے رکھے گئے ہیں۔

قطر نے بڑی احتیاط سے اپنی تاریخ اور روایات کو محفوظ کیا ہے۔ عوام اور حکمراں دل سے اپنے وطن کی سرزمین سے محبت کرتے ہیں اور اس کے حال اور مستقبل دونوں کے بارے میں سنجیدگی سے کام کر رہے ہیں۔ ۴۰ برس قبل یہاں صرف ماہی گیری اور موتیوں کے لیے غوطہ خوری ہوتی تھی۔ تیل اور گیس کی دریافت ہوئی تو حکومت اور عوام دونوں نے مل کر بڑی لگن سے کام کر کے ملک کو ترقی کی شاہراہ پر گام زن کردیا۔

نونہالو! تاریخ ہمیشہ بنائی جاتی ہے۔ انسان بڑے بڑے کارنامے سرانجام دیتے ہیں۔ انکشافات کرتے ہیں۔ ایجادات کرتے ہیں۔ نئے نئے علوم اور فنون قائم کرتے ہیں۔ شہر بناتے ہیں۔ شہر آباد کرتے ہیں۔ یہ سب تاریخ بنانا ہے۔ ان حالات کا لکھ لینا اور لکھ کر محفوظ کردینا تاریخ ہے۔ تاریخ نویسی ہے۔ تاریخ لکھنے کا فن مسلمانوں کی اختراع ہے۔ اس کا آغاز مسلمانوں نے کیا۔ اسی لیے مسلمانوں کی ساری تاریخ محفوظ ہے۔ اس کے اتار چڑھاؤ سب کے علم میں ہیں۔ قوموں کی عظمت اور رفعت میں تاریخ کو زبردست اہمیت حاصل ہے۔ چراغ سے چراغ جلتا چلا جاتا ہے اور پرانی



قطر یونی ورسٹی

تاریخ سے نئی تاریخ جنم لیتی رہتی ہے۔ تاریخ سے انسان کو اپنا ماضی معلوم ہوتا رہتا ہے۔ اس ماضی سے روشنیاں جلتی ہیں اور حال اور مستقبل کی تعمیر ہوتی ہے۔ اس لیے تم تاریخ کے مطالعے کو اہمیت دینا۔

طلوعِ اسلام سے پہلے کی بات ہے کہ یونان کے مشہور مؤرخ ہیرو ڈوٹس (۴۸۴ تا ۴۳۵ قبل مسیح) نے جس کو "تاریخ کا باپ" کہا جاتا ہے۔ یونان اور ایران کی ۴۹۹ سے ۴۷۹ قبل مسیح تک کی جنگوں کا مفصل حال لکھا ہے۔ اس نے دنیا کی قدیم تاریخ پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ کئی ملکوں کی سیر کر کے جغرافیائی اور تاریخی حالات جمع کیے ہیں۔ اس نے مختلف نسلوں کی تاریخ بھی بیان کی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ پہلے آبادکار کنعانی لوگ تھے جو تاریخِ عرب میں اعلا پایہ جہاز راں مشہور تھے۔

چونکہ قطر کو خلیج میں فوجی اہمیت حاصل ہے یعنی فوجی لحاظ سے اس کا محلِ وقوع اہم ہے، اس لیے یہاں اسلامی دور میں بھی بڑے بڑے جہاز راں رہے ہیں۔

آج کل جو خاندان قطر کا حکمراں ہے۔ اس کا تعلق بنی تمیم کی ایک شاخ سے ہے۔ شیخ ثانی بن محمد کے نام سے اس خاندان کو ثانی خاندان کہتے ہیں۔ اس کے بیٹے محمد بن ثانی نے اس ملک میں ۱۸۶۸ء میں اقتدار پایا تھا۔

آزادی

قطر کو مکمل آزادی ۳ ستمبر ۱۹۷۱ء کو حاصل ہوئی۔ اس کے فوراً بعد یہ ملک اقوامِ متحدہ (UNITED NATIONS) اور عرب لیگ (ARAB LEAGUE) کا رکن بن گیا۔ ماضی کی بات یہ ہے کہ لندن

سے انگریز یہاں قطر آئے اور اس پر انھوں نے قبضہ جمالیا۔ یہاں حکومت کرنے لگے۔ یہ ۱۹۱۶ء کی بات ہے کہ انگریزوں اور قطر کے درمیان تحفظ کا ایک معاہدہ ہوا تھا۔ ۳ ستمبر ۱۹۷۱ء کو اس معاہدے کو ختم کردیا گیا اور قطر ایک آزاد ملک بن گیا۔ ۲۲ فروری ۱۹۷۲ء کو امیر شیخ خلیفہ بن حمد الثانی عوام کی تائید سے امیر بنے۔ انھوں نے عمدہ حکمتِ عملی سے ملک کے نظام کو سنوارا۔ مئی ۱۹۷۷ء میں امیر نے شیخ حمد بن خلیفہ الثانی کو اپنا ولی عہد، وزیر دفاع اور افواج کا سپہ سالار بنایا۔

جغرافیائی رقبے اور آبادی کے لحاظ سے تو قطر ایک چھوٹی عرب ریاست ہے، لیکن مغرب اور عرب ملکوں کے درمیان افہام و تفہیم کے سلسلے میں قطر نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس نے ایک جامع اور متوازن ترقیاتی منصوبے کا نفاذ کیا ہے جس کی وجہ سے قطر کو دنیا میں وقار حاصل ہوا ہے۔

آب و ہوا

قطر دیکھا جائے تو خشکی کا ایک ٹکڑا ہے۔ چوں کہ سمندر تین طرف ہے اس لیے صحرا کی گرمی سمندر کے پانی کی وجہ سے معتدل رہتی ہے۔ اس کی سطح ہموار ہے۔ ہوا میں نمی درمیانے درجے کی ہے۔ عام طور پر دسمبر اور جنوری میں بارش ہوتی ہے۔ بعض اوقات موسلا دھار بارش ہوتی ہے اور کبھی کبھی اولے بھی پڑتے ہیں۔ موسمِ سرما میں دن کو خوش گوار دھوپ ہوتی ہے اور راتیں قدرے خنک ہوتی ہیں۔ جنوری کا اوسط درجۂ حرارت ۱۷ سنٹی

گریڈ ہوتا ہے۔ گرمیوں میں درجۂ حرارت ۵۲ درجے سنٹی گریڈ تک جا پہنچتا ہے۔ راتوں کا اوسط درجۂ حرارت ۲۲ درجے کے لگ بھگ رہتا ہے۔ گرمیوں میں شمال کی طرف سے آنے والی ہواؤں سے درجۂ حرارت قدرے معتدل ہوجاتا ہے۔ اللہ کے فضل و کرم سے ملک خوش حال ہے۔ تمام عمارتوں، دفتروں، اسٹوروں یہاں تک کہ موٹر کاروں میں بھی کنڈیشنر لگے ہوئے ہیں۔ سردیوں میں سمندر کا درجۂ حرارت ۲۰ سے ۲۲ درجے سنٹی گریڈ رہتا ہے اور کبھی کبھی ساحلی کھاڑیوں میں یہ ۱۵ درجے تک ہوتا ہے جس کی وجہ سے یہاں سال بھر سمندری پانی کے کھیل (کشتی رانی) وغیرہ ہوسکتے ہیں۔

ثقافتی میراث

نونہالو! قطر کے دارالحکومت دوحہ کی کیا بات! میں ۱۹۷۹ء میں یہاں آیا تھا تو بھی یہ عرب ریاست نہایت شان دار تھی اور اب جو میں ۱۹۹۴ء میں آیا تو حیران رہ گیا! دور دور تک عمدہ محلّات، خوب صورت مساجد، فوّارے اور بازار پھیلے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ایک بات پر ذرا غور کرو۔ یہاں تم کو قدیم اور جدید دونوں قسم کے فنِ تعمیر بغل گیر ہوتے دکھائی دے رہے ہیں۔ لطف یہ ہے کہ ان میں اُوپرا پن نہیں بلکہ ایک خوش نما ہم آہنگی نظر آتی ہے۔ اب آؤ ذرا اس مسجد کو غور سے دیکھو۔ جامع مسجد کئی گنبدوں اور عالی شان فانوسوں کی وجہ دیکھنے والوں کے لیے کس قدر باعثِ کشش ہے۔ اس کے علاوہ جامع ابوبکر صدیقؓ اور جامع عمر ابن الخطابؓ اپنے روایتی طرزِ تعمیر کی وجہ سے ہر سیاح کی توجّہ کا مرکز بنتی ہیں۔

لائبریری

بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ میں یہاں لائبریری نہ جاؤں۔ لائبریری تو میری جان ہے۔ اگر میں پاکستان میں لائبریری تحریک نہ چلاتا تو واقعی میں بیمار پڑجاتا! اور اب پاکستان کی سب سے بڑی لائبریری بنا کر تو میں نونہال بن گیا ہوں! اسی لیے تو اپنے عظیم نونہالوں سے کہتا رہتا ہوں کہ مطالعہ پر توجہ کریں۔ جو لوگ پڑھتے رہتے ہیں وہ بڑے ہوتے رہتے ہیں۔ مطالعہ بڑائی کی کنجی ہے۔

قطر کی قومی لائبریری کم یاب کتابوں، نادر مخطوطوں اور عمدہ کتابوں کے ذخیرے کی وجہ سے قابلِ دید ہے۔ ایک پرانے محل میں قومی عجائب گھر قائم ہے۔ ایک تو خود عمارت دیکھنے کی چیز دوسرے اس میں قطری ثقافت کے نمونے قابلِ دید ہیں۔ قطریوں کے روایتی ملبوسات اور ظروف کئی کمروں میں سلیقے سے رکھے ہوئے ہیں۔ میوزیم دراصل چند عمارتوں کا ایک حسین مجموعہ (کمپلیکس) ہے۔ نئی عمارت میں تاریخ کے مختلف ادوار کے آثار، بدّوؤں کے خیمے اور قطری اشیاء محفوظ ہیں۔ ذرا دیکھو کہ یہاں ایک مچھلیوں کا تالاب بھی ہے۔

شہر کے باہر پانی کے کنارے ایک بڑی چوڑی سڑک ہے جو ایک عمدہ اور پُرفضا سیرگاہ ہے۔ اس میں کئی پارک ہیں جہاں مختلف لوگ اپنے اہل و عیال سمیت تفریح کے لیے جاتے ہیں۔

دوحہ میں ایک چڑیا گھر بھی ہے۔ آؤ ذرا وہاں چلتے ہیں۔ حیرت ہے کہ اس میں نہ صرف قطر کے بلکہ دنیا بھر کے جانور اور پرندے ہیں۔ کیا بچّے اور کیا بڑے سب یہاں آکر محظوظ ہوتے ہیں۔ کیا رائے ہے تمہاری!

قطر کا نظامِ شوریٰ امارت ہے۔ مجلسِ شوریٰ ممتاز اور مدبّر ۳۰ ارکان پر مشتمل ہے۔ یہ مجلس ترقی کی مختلف تجاویز پیش کرتی ہے۔ مجلسِ وزراء ان تجاویز کو قانونی شکل دے کر ان کا نفاذ کرتی ہے۔ عدلیہ آزاد ہے۔ اس کے انتظامی امور کے لیے وزیرِ انصاف جواب دہ ہے۔

قطر میں اسلام کی آمد

جنوبی نجد، احسا اور قطر کے علاقے میں بکر ابن وائل، عبدالقیس، تمیم کی بعض شاخیں اور عمان کے ازد قبائل آباد تھے۔ اسلام سے پہلے یہ مختلف قبائل ایک دوسرے سے لڑتے رہتے تھے۔ اس کی ایک مثال حرب بسوس ہے جو بسوس اور داحس قبیلوں کے درمیان ۴۰ برس تک جاری رہی۔ جارحیت اور انتقامی کارروائیوں سے ہزاروں لوگ اپنی جانیں کھو بیٹھے۔

صحرائے عرب کی زندگی ہی ایسی ہے جہاں ہر شخص آزاد ہوتا ہے۔ سوائے خاندان کے شیخ اور قبیلے کے شیخ کے وہاں نہ کوئی بادشاہ ہوتا ہے نہ حکمراں۔ آزاد عرب اپنی آزادی کی روح کو غیرت اور جواں مردی سے زندہ رکھتے ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے زمانے میں قطر کے مغرب میں واقع بحرین کا امیر منذر ابنِ سوی تھا۔ ۶۲۸ء میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے العلاء الحضرمی کو اپنا مکتوبِ گرامی دے کر منذر کے پاس بھیجا اور اسے اسلام کی دعوت دی۔ اس خط کا متن تاریخ میں موجود ہے۔ منذر نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت قبول کی۔ بکر ابن وائل اور عبدالقیس وغیرہ

قبائل مسلمان ہوگئے۔ ان لوگوں کی صحیح تعلیم تو ہوئی نہ تھی۔ جونہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوا اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ خلیفہ بنے، بکر ابن وائل کا قبیلہ مرتد ہوگیا۔ انھوں نے کہا کہ وہ نہ زکوٰۃ دیں گے اور نہ نماز پڑھیں گے۔ ان کو مطیع بنانے کے لیے العلاء الحضرمی کو فوج دے کر یہاں بھیجا گیا۔ قبیلہ عبدالقیس ... نے حضرمی کی مدد کی اور مرتدوں کو شکست ہوئی۔ اس وقت سے قطری اسلام کے شیدائی اور فدائی چلے آتے ہیں۔ حضرمی ایک قابل جرنیل تھا۔ اس نے سمندر عبور کرکے جنوبی ایران کے ساحل پر جہاد کیا۔ اس دوران حضرمی فوت ہوگیا۔ اس کے بعد عثمان ابن ابی العاص الثقفی گورنر مقرر ہوا۔ اس نے شیراز اور اسطخر (تختِ جمشید) کو فتح کرلیا۔ یہ گورنری بحرین، قطر اور احساء پر مشتمل تھی۔

جنگ صفین (۳۷ھ / ۶۵۷ء) کے موقع پر ایک خارجی فرقہ ظاہر ہوا۔ قطر کے ایک شخص قطری بن الفجاء اس فرقہ کے بہادر امیر اور شاعر تھے۔ اس نے جنوبی ایران اور قطر اور بحرین پر حکومت قائم کر رکھی تھی۔ ۶۹۴ء میں اس کے نام کا سکہ بھی جاری ہوا۔

قطر کے ایک اور شخص علی بن محمد صاحب الزنج مشہور ہیں۔ انھوں نے حبشیوں کو ساتھ ملا کر عباسی حکومت کے دوران زبردست بغاوت کی۔ بصرہ کو فتح کرلیا۔ کئی لاکھ عباسی فوجی مارے گئے۔ یہ واقعات ۸۶۶ سے ۸۸۳ء تک ہیں۔

قرامطہ کا فرقہ بھی بحرین اور قطر کے علاقے سے اٹھا۔ اس کا بانی ابوسعید الجنابی تھا۔ اس کا خلیفہ ابوطاہر سلیمان ابنِ علی سعید تھا۔ انھوں نے

عرب، مصر، عراق، یمن، حجاز اور شام تک زبردست تخریبی کارروائیاں کیں۔ ہزاروں لوگوں کو تہ تیغ کیا۔ ۹۲۳ء میں مکّہ پر ہلّہ بول کر حجرِ اسود کو چُرالیا۔ ۲۱ برس کے بعد فاطمی سلطان المنصور کے حکم سے ۹۵۱ء میں واپس کیا۔

۴۶۹ ہجری (۱۰۷۶ء) میں احساء کے قبیلہ عبدالقیس نے قرامطہ کی بیخ کنی کی، لیکن اس وقت تک یہ کئی مسلمان ملکوں میں بدنظمی اور انتشار پھیلا چکے تھے۔

نصف اٹھارویں صدی میں نجد، کویت اور بحرین کے لوگ قطر میں آئے۔ ان میں خلیفہ خاندان بھی شامل تھا جو الزبر اور خور میں آباد ہوا۔ خلیفہ خاندان نے قطریوں سے مل کر بحرین پر قبضہ کرلیا۔ اس زمانے میں موجودہ امیر کے جد محمدؐ ابنِ ثانی موتیوں کے کاربار میں مصروف تھے۔ ۱۸۶۸ء میں انھیں اقتدار حاصل ہوا۔

قطر کا معمار

قطر کا معمار شیخ قاسم کو سمجھا جاتا ہے جو محمد ابنِ ثانی کے بیٹے تھے وہ ۱۸۷۸ء سے ۱۹۱۳ء میں اپنی موت تک امیر رہے۔ انھوں نے اپنے سیاسی تدبّر سے قطری قبیلوں کی حمایت حاصل کی۔

۱۹۱۳ء میں اُن کے بیٹے شیخ عبداللہ ابن قاسم امیر بنے۔ یہ جنگِ عظیم اوّل کا زمانہ تھا۔ ترکی اور برطانیہ نے قطر کی آزادی کو تسلیم کیا۔ ۱۹۱۶ء میں شیخ عبداللہ نے برطانیہ سے ایک اور معاہدہ کیا۔ برطانیہ کا اثرو رسوخ یہاں بڑھ گیا۔

۱۹۳۹ء میں قطر میں تیل دریافت ہوا، لیکن جنگِ عظیم دوم کی وجہ

سے اس کو نکالنے کا کام نہ ہوسکا۔ ۱۹۴۹ء میں شیخ عبداللہ نے امارت سے دست بردار ہوکر اپنے بیٹے شیخ علی بن عبداللہ الثانی کو امیر بنایا۔

۱۹۶۰ء میں شیخ علی بھی امارت سے دست بردار ہوگئے۔ اُن کے بیٹے شیخ احمد بن علی الثانی امیر بنے۔ ۱۹۴۹ء سے تیل نکالنے کا کام شروع ہوچکا تھا۔ ۱۹۶۰ء میں تیل کی تنظیم اوپیک قائم ہوئی۔ قطر اس کا رکن بن گیا۔

قطر کو مکمّل آزادی ۳ ر ستمبر ۱۹۷۱ء کو حاصل ہوئی۔ ۲۲ ر فروری ۱۹۷۲ء کو امیر خلیفہ بن حمد الثانی حکمراں بنے۔ ۱۹۷۷ء میں امیر نے شیخ حمد ابن خلیفہ الثانی کو ولی عہد، وزیرِ دفاع اور کمانڈر ان چیف مقرر کیا۔

ریاست قطر۔ دل چسپ مقامات

نونہالو! تم کو یہ تو اب خوب معلوم ہے کہ میں سیّاح ہوں—— سعید سیّاح! میں جب کسی ملک میں جاتا ہوں تو سیّاح بن جاتا ہوں اور پیدل، یا بسوں کاروں میں اِدھر سے اُدھر جاتا رہتا ہوں اور ہر چیز کو غور سے دیکھتا رہتا ہوں۔

تم سب اب میرے ساتھ اس بس میں سوار ہوجاؤ۔ میں تم کو ریاست قطر میں جگہ جگہ لے چلتا ہوں۔

اُمّ سعید اور دوحہ کے درمیان وقرہ واقع ہے۔ یہاں ایک عجائب گھر ہے جس میں ماضی کی دست کاریوں کے نمونے نمائش کے لیے رکھے گئے ہیں۔ جس مکان میں یہ نوادرات رکھے گئے ہیں وہ بھی قدیم طرز کا ایک مکان ہے جسے مرمّت کے بعد خوش نما بنا دیا گیا ہے۔

اسی طرح قطر کے شمال میں ایک مقام الخور ہے۔ یہاں ایک تو مقامی طرزِ تعمیر قابلِ دید ہے۔ دوسرے بطور بندرگاہ اس کے دو قدیم مینار دیکھنے کے

قابل ہیں۔ پانی کے کنارے کنارے جو خوب صورت چوڑی سڑک واقع ہے وہ یہیں ختم ہوتی ہے۔ الخور سے کچھ فاصلے پر پُرفضا باغات واقع ہیں۔ اس میں تالاب، سبزہ زار، بچّوں کے کھیلنے کی جگہیں اور ریستوراں موجود ہیں۔ یہاں پر پوری گائے بیل اور بھیڑ بکری بھوننے کا عمدہ انتظام ہے۔

یہ ایک قصبہ الزُبرا تاریخی مقام کے طور پر مشہور ہے۔ اب اس میں آبادی نہیں لیکن تم غور کرو کہ اس کا قلعہ اور بعض مکانات قدیم طرزِ تعمیر کی عکاسی کرتے ہیں۔ اب ہم جنوب مشرقی کونے میں ہیں۔ یہاں یہ ایک کھاڑی خور العدید ہے۔ اس کھاڑی کے اطراف میں چالیس میٹر بلند ریت کے ٹیلے ہیں۔ ذرا دیکھو کہ بعض ٹیلے اپنی بناوٹ کی وجہ سے کس قدر جاذبِ نظر ہیں۔

قطر کے مغربی ساحل سے اندرون ملک ریت کے ٹیلوں کا ایک خوب صورت موج در موج سلسلہ پھیلا ہوا ہے۔ یہ خالص صحرائی علاقہ ہے۔ اس کا منظر، اس کا ماحول اور اس کی آب و ہوا سب چیزیں صحرا کی مکمل عکاسی کرتی ہیں۔ ریت کے ذرّات خاصے باریک ہیں۔ ساحل کے قریب ریتلے حصّے کا رنگ قدرے زرد ہے اور اندرونِ ملک جاکر گہرا نارنجی ہوجاتا ہے۔ ریت کے ٹیلے حجم میں کم ہیں مگر بالکل عمودی۔ یہاں ہمیں پھونک پھونک کر قدم رکھنا ہے۔ اس غیر مزروعہ غیر آباد صحرا کا سفر ایک سنسنی خیز تجربہ ہے جس کا اپنا ایک خاص لطف ہے۔ بعض مقام ایسے آتے ہیں کہ آدمی پنڈلیوں اور گھٹنوں تک ریت میں دھنس جاتا ہے۔ اس لیے نو آموز مُہم جُو سیّاحوں کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ ایک جماعت اور کارواں کی صورت میں اس صحرا کو طے کریں۔

قطر میں خاص طور پر صحرا میں خیمہ زن ہوکر ماحول سے لطف اندوز

ہونے کا لوگوں کو بڑا شوق ہے۔ ملکی اور غیر ملکی لوگ بدوؤں کی نقل کرتے ہوئے یہاں خیمے لگاتے ہیں۔ اس شوق سے صحرا کی گاڑی سفاری وجود میں آئی اور پھر کھیل اور تفریح کے طور پر ریت پھسلن (Sand Skiing) کا کھیل مقبول ہوا۔ جب لوگ ریت پر پھسلتے پھسلتے بہت دور جا پہنچتے ہیں تو ایک فور وہیل گاڑی انھیں واپس لے آتی ہے۔ اب وہ زمانہ آگیا ہے کہ صدیوں پرانی تہذیب والے اس صحرائی ملک میں مغربی طرز کے کھیل اور تفریحی سرگرمیاں رائج ہورہی ہیں۔ یہ صرف اس وجہ سے نہیں کہ یہاں کئی غیر ملکی رہتے ہیں بلکہ یہاں کے ملکی لوگ بھی ان میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیتے ہیں۔

تمام بڑے ہوٹلوں میں بے شمار تفریحی سہولتیں دست یاب ہیں بلکہ ان ہوٹلوں نے سمندر کے کنارے اپنے ہوا بندر (Beach) بنا رکھے ہیں۔ پانی کے کھیل، کشتی رانی جیسے متعدد کھیلوں کے لیے عمدہ آب و ہوا اور مناسب ماحول دست یاب ہے۔ ساحل پر صدیوں پرانے طرز کے سمندری ڈونگے کرائے پر ملتے ہیں۔ سیرگاہوں میں ایسے کباب گھر ہیں جہاں سالم بھیڑ بکریاں اور گائیں آگ پر بھون کر دعوتِ کام و دہن کے لیے پیش کی جاتی ہیں۔ کچھ لوگ کسی مناسب کمرے میں بچّوں کے ساتھ دن گزارتے ہیں، کچھ مچھلی پکڑنے کا سامان لیے دن بھر ڈونگوں میں مچھلی کا شکار کرتے ہیں۔ کچھ لوگوں نے کرائے پر گھوڑے فراہم کرنے کا انتظام کر رکھا ہے۔ بچے، نونہال، نوجوان اور ماہر گھڑسوار، سب گھڑسواری سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ گھڑسواری کا ایک اچھا کلب موجود ہے۔ ماہر سوار تربیّت کے لیے دست یاب ہیں۔

قطر کے لوگ سنّی عقیدے سے تعلق رکھتے ہیں۔ جہاں پر قران و سنّت پر مبنی قوانین رائج ہیں۔ لوگ صوم و صلوٰۃ کے پابند ہیں۔ رمضان بڑے احترام سے منایا جاتا ہے۔ غیر مسلموں کو بھی یہ مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ دوسرے لوگوں کے سامنے کھانے پینے سے پرہیز کریں۔ تمام مسلمان اپنی آمدنی کا چالیسواں حصّہ بطور زکوٰۃ دیتے ہیں۔ قطری حج کی سعادت حاصل کرنے کی بڑی سعی کرتے ہیں۔ حج صرف ایک بار ان لوگوں پر فرض ہے جن کے پاس وسائل ہوں۔

قطر میں صنعتیں

عظیم نونہالو!

قطر کے حکم راں نہایت دور اندیش ہیں، یعنی جو حالات کل پیدا ہوں گے ان کے بارے میں وہ آج غور کررہے ہیں۔ قطر کی ثروت کا انحصار تیل پر ہے۔ اگر کل تیل کو اہمیّت حاصل نہ رہی، اور تیل کا کوئی بدل پیدا کرلیا گیا تو پھر قطر میں زندگی کا کیا حال ہوگا۔ اچانک ثروت غربت میں بدل جائے گی۔ اس لیے قطر کے حکم راں قطر کو ایک صنعتی ملک بنانے پر توجّہ کررہے ہیں۔

اب تم آؤ اور میرے ساتھ چلو۔ میں تم کو قطر میں صنعتوں کی سیر کراؤں گا۔

تیل کی صنعت

قطر میں تیل کی دریافت ۱۹۳۹ء میں ہوئی تھی۔ پیداوار ۱۹۴۹ء میں شروع ہوئی۔ پھر ۱۹۴۳ء میں ساحل کے قریب پانی میں تیل دریافت ہوا جس کی پیداوار ۱۹۶۶ء میں شروع ہوئی۔

تیل ایک تو دخان فیلڈ سے اور دوسرے شمال میں ادالشرقی، میدم محزن اور ابوالحنین سے نکالا جارہا ہے۔

گیس

قطر گیس کے ذخائر سے بھی مالا مال ہے۔ خف اور شمال مغربی گنبد میں گیس نکالنے کی فیلڈ ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق قطر کے گیس کے ذخائر ہالینڈ کی گرو ننجن فیلڈ سے بھی زیادہ ہیں۔ ایک اور اندازے کے مطابق دنیا بھر کے معلومہ گیس کے ذخائر کا ۴ فی صد قطر کے پاس ہے۔

گیس کو مائع حالت میں منتقل کرنے کے پلانٹ لگائے گئے ہیں۔ مائع گیس کے خریداروں میں جاپان اور کوریا شامل ہیں۔

قطر کے بعض پلانٹ گیس ہی سے چلائے جارہے ہیں، مثلاً راس ابوفناس کا بجلی گھر اور کھاری پانی کو میٹھا کرنے کا پلانٹ اور اُمِّ سعید کا تمام اسٹیل کمپلیکس گیس استعمال کررہے ہیں۔

پانی کے وسائل

میٹھے پانی کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے راس ابوعبود اور دوحہ کے قریب راس ابوفناس میں دو پلانٹ کام کررہے ہیں۔ دونوں روزانہ ۶۸ ملین گیلن پانی فراہم کررہے ہیں۔ ایک اور پلانٹ الواصل میں لگایا جارہا ہے۔

مصنوعی کھاد

قطر میں مصنوعی کھاد امونیا اور یوریا تیار کرنے کے پلانٹ لگے ہوئے ہیں۔

اسٹیل کمپلیکس

اُمّ سعید میں ایک بہت بڑا اسٹیل کمپلیکس ہے جو ۱۹۷۸ء میں لگایا گیا تھا۔ یہاں اسٹیل، اسپینج آئرن اور اسٹیل بار تیار کی جاتی ہیں۔

پیٹروکیمیکلز

اُمّ سعید میں پیٹروکیمیکلز کا پلانٹ ۱۹۸۱ء میں لگایا گیا تھا۔ ۱۹۸۸ء سے اس کی پیداوار میں ایتھی لین، پولی تھائی لین اور سلفر شامل ہیں۔

سیمنٹ

قطر میں جپسم اور اچھی قسم کا چونے کا پتھر ملتا ہے۔ ۱۹۶۹ء میں اُمّ باب میں سیمنٹ پلانٹ لگایا گیا۔ بعد کے سالوں میں اس کی توسیع ہوئی۔

زراعت

قطر کی زمین زیادہ تر صحرائی ہے۔ کہیں کہیں گہرے کنوؤں کے ذریعہ سے پانی نکالا جاسکتا ہے۔ اندازہ ہے کہ کُل قابلِ کاشت زمین ۲۸ ہزار ہیکٹر ہے۔ ملک میں بہت سے زرعی فارم ہیں۔ زرعی پیداوار میں غلّہ، کھجور، پھل، سبزیاں اور ہرا چارہ شامل ہے۔

مویشیوں کے فارم

قطر نے مویشیوں کے فارم بنانے میں بہت دل چسپی لی ہے۔ اوسٹریلیا سے ایک ہزار فری سین گائیں منگوا کر ایک ڈیری فارم بنایا گیا ہے۔ دوحہ سے ۳۵ کلومیٹر کے فاصلے پر اُمّ قرن میں گائیں دودھ سدا کر رہی ہیں۔ ابو سمرہ میں بھیڑوں کا ایک بڑا فارم ہے۔ اُمّ قرن میں ایک پولٹری بھی قائم ہے۔

قطر خاص طور پر عربی نسل کے گھوڑوں میں دل چسپی رکھتا ہے۔ الریان میں ہر جمعہ کو گھڑدوڑ بھی منعقد ہوتی ہے۔ اسی طرح یہاں سفید

رنگ کے عربی ہرن بھی پالے جاتے ہیں۔

ماہی گیری

ایک زمانہ تھا کہ قطر کے بہت سے لوگوں کا پیشہ ماہی گیری تھا۔ اب عام ماہی گیروں کے علاوہ حکومت نے ٹرالر رکھے ہوئے ہیں۔ مچھلی کی پیداوار کو محفوظ رکھنے کے لیے سردخانے کا انتظام ہے۔ مچھلی کی پیداوار ملکی ضروریات کے لیے کافی ہے۔

تجارت

قطر میں چیمبر اوف کامرس ۱۹۶۳ء سے قائم ہے۔ اسی طرح ایک بڑے پیمانے کا ادارہ ہے جو جہاز رانی اور ٹرانسپورٹ کا انتظام کرتا ہے۔ اُمّ سعید اور دوسرے مقامات سے عرب ملکوں کو مصنوعی کھاد اور پیٹروکیمیکلز پہنچانے کا کام اس ادارے کے ذمّے ہے۔ قطر اسٹیل کمپنی نے اپنے ٹرک رکھے ہوئے ہیں۔ تیل، مصنوعی کھاد، پیٹروکیمیکلز اور اسٹیل یہ چار چیزیں بڑی برآمدات میں شامل ہیں۔ جب کہ درآمدات میں مشینری، ٹرانسپورٹ کا سامان، مصنوعہ مال، غذا اور مویشی وغیرہ شامل ہیں۔ قطر برطانیہ، جاپان، امریکا اور جرمنی سے تجارت کرتا ہے۔

مواصلات

شمال سے جنوب اور مشرق سے مغرب کے تمام شہر سڑکوں کے ذریعہ سے ایک دوسرے سے منسلک ہیں۔ دوحہ میں سب سے بڑی بندرگاہ ہے اس کے بعد اُمّ سعید کی بندرگاہ بھی گہرے پانی والی ہے۔ مصنوعات عام طور پر اُمّ سعید کی بندرگاہ سے باہر بھیجی جاتی ہیں۔

ان کے علاوہ الخور، الزبرہ، الوکرہ اور زیکریت میں چھوٹی بندرگاہیں موجود ہیں۔ دوحہ میں انٹرنیشنل ائرپورٹ ہے۔ اس سے ۱۵ سے زیادہ ائرلائن کمپنیاں باہر کی دنیا سے رابطہ فراہم کرتی ہیں۔

قطر نے ۱۹۷۶ء میں پہلا ارضی سٹیلائٹ چھوڑا۔ ۱۹۸۶ء میں دوسرا سٹیلائٹ چھوڑا گیا اور ۱۹۸۵ء میں ایک اور سٹیلائٹ صرف عرب ممالک سے رابطے کے لیے چھوڑا گیا۔

قطر کی اپنی براڈ کاسٹنگ سروس ہے جس کے ۱۲ ٹرانسمیشن اسٹیشن قائم ہیں۔ ان سے عربی کے علاوہ اردو، انگریزی اور فرانسیسی میں نشریات ہوتی ہیں۔

تعلیم

جدید تعلیم ۱۹۵۶ء میں شروع ہوئی پرائمری، درمیانی اور ثانوی تعلیم کے علاوہ ٹیکنیکل اسکول اور ٹیچر ٹریننگ کالج بھی ہیں۔ ۱۹۷۷ء میں دوحہ میں قطر یونی ورسٹی قائم ہوئی۔

غیر ملکی لوگوں کی تعلیم

قطر میں مقامی طور پر عربی زبان میں تعلیم دی جاتی ہے، لیکن غیرملکیوں کے لیے برطانیہ کے نصابِ تعلیم پر مبنی انگریزی اسکول بھی ہیں۔ اس کے علاوہ ہندوستانیوں، امریکنوں، مصریوں، فرانسیسیوں، جاپانیوں، فلپینیوں اور پاکستانیوں کی تعلیم کا انتظام ہے۔

صحت

قطر میں پانچ بڑے ہسپتال ہیں: حماد جنرل ہسپتال، الرمیلہ ہسپتال،

میٹرنٹی ہسپتال، دوحہ ہسپتال اور آسولیشن ہسپتال۔ دو ہسپتال مدینتہ الشمل اور الخورس میں ہیں۔ میں تم کو ایک ہسپتال کا حال آگے چل کر بتاؤں گا بلکہ تم کو اپنے ساتھ لے چلوں گا۔ بڑا دل چسپ تجربہ ہوگا۔

ہسپتالوں کے علاوہ بہت سے ہیلتھ سینٹر ہیں۔ ہر سینٹر میں ۶ ڈاکٹر کام کرتے ہیں جو ۴۰ سے ۵۰ مریضوں کو روزانہ دیکھتے ہیں۔ اگر کسی مریض کو ہسپتال بھیجنے کی ضرورت ہو تو یہ ڈاکٹر انھیں بھجواتے ہیں۔

لوک ورثہ

قطر میں موتیوں کے لیے غوطہ خوری، ماہی گیری، لکڑی کا عام کام، کشتی سازی، زیورات سازی، ملبوسات کی تیاری، مصوری، لوک گیت، لوک رقص اور لوک کھیلیں ہمیشہ سے مقبول رہی ہیں۔ حکومت ان فنون کو ترقی دینے میں ہمیشہ کوشاں رہتی ہے۔

لوگوں کی تفریح کے لیے سینما ہال بھی ہیں۔

مضافاتِ دوحہ

صدر مقام دوحہ ہے۔ اس میں حکومت کے دفاتر، مالی اور تجارتی مراکز یونی ورسٹی اور ہسپتال واقع ہیں۔

اس کے مضافات میں ۷ کلومیٹر پر الریان واقع ہے۔ یہاں جو عمارتیں تعمیر کی گئی ہیں ان میں مشرق اور مغرب کے فنِ تعمیر کا امتزاج نظر آتا ہے۔

دوحہ سے ۶ کلومیٹر پر مدینتہ الخلیفہ واقع ہے۔ یہاں شہریوں کے علاوہ وہ مکانات بھی ہیں جو حکومت نے شہریوں کو بطور عطیہ دے دیے ہیں۔

اُمِّ سعید

یہ دوحہ کے بعد دوسرا بڑا شہر ہے یہاں پٹروکیمیکلز اور اسٹیل کمپلیکس واقع ہے اور ایک گہرے پانی والی بندرگاہ ہے جہاں سے برآمدات باہر بھیجی جاتی ہیں۔ گویا یہ صنعتی شہر ہے۔

الخور

تاریخی لحاظ سے یہ ایک قدیم شہر ہے۔ یہاں پرانے طرز کی بندرگاہ، کشتیاں اور ماہی گیری کی کشتیاں موجود ہیں۔ رفتہ رفتہ حکومت اسے ترقی دے کر جدید بنا رہی ہے۔

الوکرہ

دوحہ اور اُمِّ سعید کے درمیان یہ ماہی گیری کا مرکز ہے۔

دُخان

مغربی ساحل پر واقع اس مقام پر تیل کی فیلڈ ہے۔ یہاں سیر کے لیے خوب صورت ہوا بندر تعمیر کیے گئے ہیں۔

مدینتہ الشمال

شمالی سرے پر جدید طرز کا شہر ہے۔

الزُبرہ

یہ بھی شمال میں واقع ہے۔ یہاں چند آثار قدیمہ مثلاً قلعے وغیرہ واقع ہیں۔

اُمِّ باب

یہ شہر دخان کے جنوب میں ہے۔ یہاں سیمنٹ فیکٹری اور تیل کی

پائپ لائن کی دیکھ بھال کا انتظام ہے۔

بازار

عربی زبان میں بازار کو سوق کہتے ہیں۔ دوحہ کے بازار میں ہر قسم کے اسٹور ہیں جہاں ممنوعہ اشیا کو چھوڑ کر دنیا کی ہر چیز دست یاب ہے۔

ممنوعہ اشیاء

قطر میں اسلحہ، آتش بازی، فحش تصاویر، منشیات اور خطرناک ڈرگس، جعلی سکے اور جعلی بینک نوٹ، شراب اور خنزیر کی مصنوعات لے جانا منع ہے۔

پالتو جانور

گھریلو جانوروں کو لانے کی اجازت صرف اس صورت میں ملتی ہے کہ سرکاری محکمۂ صحت کا سرٹی فیکٹ لیا جائے۔ اس کے باوجود پالتو جانوروں کو ہلکاؤ کے ٹیکے لگوانے بھی ضروری ہیں۔ حکومت نے وٹرنری ہسپتال کھول رکھے ہیں۔ بعض ایسے وٹرنری کلینک ہیں جن میں لوگ اپنے پالتو جانور جمع کراسکتے ہیں اور وہ ان کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔

لباس

قطر کی حکومت غیرملکیوں کو اس بات کا مشورہ دیتی ہے کہ وہ معقول لباس پہن کر باہر نکلا کریں۔ غیر ملکی خواتین کو بازاروں میں بنیان اور نیکر پہن کر جانے کی اجازت نہیں البتہ وہ تیرنے اور نہانے کے کلبوں میں ایسا لباس پہن سکتی ہیں۔

تعطیلات

مسلمان ریاست ہونے کی وجہ سے جمعہ کو تعطیل ہوتی ہے۔ بینک اور دفاتر بند ہوتے ہیں۔ عیدالفطر اور عیدالاضحیٰ کے موقع پر تین تین دن کی چھٹی ہوتی ہے۔ ۳ ر ستمبر کو قطر کا یومِ آزادی ہوتا ہے۔ یہ بھی چھٹی کا دن ہے۔

اوقاتِ کار

جمعہ کو چھوڑ کر باقی دنوں میں سرکاری دفاتر ۶ بجے صبح سے ایک بجے دوپہر تک کھلتے ہیں۔ بینک ساڑھے سات بجے صبح سے ساڑھے گیارہ بجے تک کھلے رہتے ہیں۔ تجارتی دفاتر کے کھلنے کے اوقات کچھ زیادہ ہیں۔ صبح ساڑھے سات سے ساڑھے بارہ بجے تک، بعد دوپہر ڈھائی بجے اور ساڑھے تین بجے سے شام کے چھ بجے تک یہ ادارے کھلے رہتے ہیں۔

سکہ

قطر کا سرکاری سکہ ریال ہے جس کے ایک سو درہم ہیں۔ ۱، ۵، ۱۰، ۵۰، ۱۰۰، اور ۵۰۰ ریال کے نوٹ رائج ہیں۔

قطر میں ناپ تول کے لیے اعشاری پیمانے استعمال ہوتے۔

چوتھا باب

عزیزہ محترم ڈاکٹر زینت

نونہالو! میرے ایک نہایت پیارے دوست تھے جناب محترم سیّد یوسف نقوی۔ کوئی تیس اکتیس سال پہلے کی بات ہے کہ اپنے بیٹے میاں خضر نقوی کے ساتھ مطب میں آئے۔ اس وقت میں ان سے واقف نہیں تھا۔ لندن سے آئے تھے۔ انگلستان کے شہری تھے۔ ان کے ساتھ رپورٹیں تھیں۔ بڑے بڑے ہسپتالوں میں علاج ہورہا تھا۔ مرض سرطان تشخیص ہوا تھا۔ مجھے اس تشخیص سے اتفاق نہیں تھا۔ بارے نقوی صاحب کو مایوس کردیا گیا تھا۔ وہ آخری رسوم کے لیے پاکستان آگئے تھے۔ سوچا مرنا تو ہے ہی، چلو ذرا حکیم سعید سے بھی علاج کرالیں!

میں نے ان کو نہایت محبت سے دیکھا۔ ان کا علاج بھی شروع کردیا اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے وہ اچھے بھی ہوگئے۔ لندن چلے گئے اور پھر ۳۰ سال زندہ رہے۔ نقوی صاحب سے دوستی کی یہی بنیاد بنی۔ ایسی دوستی ہوئی کہ وہ میرے ہوگئے اور میں ان کا ہوگیا۔ افسوس کہ اب وہ اس دنیا میں نہیں ہیں۔ جناب محترم نقوی صاحب کے ہاں ایک نوجوان ڈاکٹر زینت

رضوی سے ملاقات ہوئی۔ یہ ۱۹۷۱ء کی بات ہے۔ میں نہایت بڑا اور خطرناک اپریشن کرا کے لندن آیا تھا اور نقوی صاحب کے ہاں مقیم تھا۔ ان کے گھر میں ایک "حکیم صاحب کا کمرہ" تھا۔ اس کی ایک الماری میں میری ایک دو شیروانیاں رہتی تھیں۔

ڈاکٹر زینت رضوی کو میرے اپریشن سے خاصی دل چسپی رہی۔ انھوں نے تفصیل سے حال پوچھا۔ میں نے جب ان کو بتایا کہ ۲ رمئی ۱۹۷۱ء کو اپریشن کے بعد میں نے پورے امریکا کا دورہ کیا ہے تو وہ زیادہ حیران ہوئیں۔ حیران تو اس وقت امریکا کے سارے وہ دوست بھی ہوئے تھے جہاں جہاں میں گیا تھا۔ میری ہمت کی داد دیتے تھے!

ڈاکٹر زینت پھر اپنی ہوگئیں۔ انگلستان کے بڑے ہسپتالوں میں کام کرتی تھیں۔ پھر حالات نے ان کو انگلستان سے باہر بھیج دیا۔ سعودی عرب میں خدمات انجام دیں اور اب دوحہ (قطر) میں خواتین ہسپتال کی نگرانِ اعلا ہیں۔ کوئی تین لاکھ رُپے ماہانہ تن خواہ ہے، مکان ہے، موٹر کار ہے، نوکر ہیں۔ ان تمام سہولتوں کے باوجود' اور اس کے باوجود کہ پاکستان میں حالاتِ احترام موجود نہیں ہیں' ڈاکٹر زینت پاکستان واپس آجانا چاہتی ہیں۔

ایک ہسپتال

نونہالو! ہمدرد یونی ورسٹی میں ایک "ہمدرد کالج اوف میڈیسن" قائم ہوگیا ہے۔ اب ۱۹۹۶ء میں اس کالج کے طلبہ کے لیے ایک ہسپتال لازمی ہوگیا۔ ان دنوں مجھ پر یہ تازہ ذمّہ داری سوار ہے۔ پریشان بھی ہوں کہاں سے دس کروڑ رپے لاؤں گا۔ اسی تگ و دو میں تھا کہ دوحہ سے عزیزہ زینت

کا خط آیا کہ خواتین ہسپتال کی ایک خاتون' جو ویسٹ انڈیز کی ہیں وہ پاکستان میں ایک ہسپتال قائم کرنا چاہتی ہیں۔ نام ہے مسز پیٹرز۔ ان کے پاس ۱۵۔ ۱۶ کروڑ رپیہ بھی ہے۔ میں اور مسز پیٹرز کراچی آپ کے پاس آرہے ہیں تا کہ مدینۃ الحکمت میں اس ہسپتال کی منصوبہ بندی کرلی جائے!

سبحان اللہ۔ نیکی اور پوچھ پوچھ! خوش آمدید۔ دونوں کراچی آگئیں اور ان سے تبادلِ خیال بڑی تفصیل سے ہوا۔ اس کے باوجود محترمہ پیٹرز نے یہ تاثر دیا: "حکیم صاحب نے میرے پلان پر کم توجّہ فرمائی ہے!"

ذرا کم توجّہ فرمائی

نونہالو! ڈاکٹر مسز پیٹرز کا یہ ایک چھوٹا سا جملہ میرے لیے بڑا جملہ بن گیا اور میں نے یہ فیصلہ کیا کہ میں اب خود دوحہ جاکر ڈاکٹر پیٹرز کے پلان کو دیکھوں گا تا کہ ان کو اطمینان ہوجائے کہ 'میں نے اب توجّہ کرلی ہے' اور ان کو میری طرف سے کوئی شکایت باقی نہ رہے اور جب میں دوحہ اترا تو پہلا جملہ میرا یہ تھا: "میں آپ کے ایک جملے کی خاطر اتنا سفر کرکے اور خرچ کرکے آیا ہوں۔"

نونہالو! دوحہ کا یہ تاریخی سفر صرف اس لیے ہوا کہ میں ڈاکٹر پیٹرز کی شکایت دور کرنا چاہتا تھا۔ اس سے ایک سبق یہ ملتا ہے کہ جب بھی کسی سے بات کریں پوری توجّہ سے کریں۔ ملنے والے کو اس شکایت کا موقع نہ ملے کہ اس کی بات کو غور سے نہیں سنا گیا۔ میں نے ایک خاتون کا دل نہیں دُکھایا' ان کی غلط فہمی دور کرنے کے لیے تین دن کا سفر اختیار کرلیا۔

نونہالو! ایک نہایت دل چسپ بات سوچ کر ہمیشہ ہنستا ہوں۔ قہقہہ نہیں مارتا۔ ہمارے پیارے نبی، صلی اللہ علیہ وسلم دنیا کے عظیم انسان تھے۔ نہایت درجہ بذلہ سنج، یعنی خوش مزاج۔ چٹکلوں سے لطف اندوز ہونے والے، مگر بتایا یہ گیا ہے کہ قہقہہ مارنا ان کا مزاج نہیں تھا۔ ہاں مسکرانا ان کی شان تھی۔ خیر جناب، بات یاد یہ آئی ہے کہ یہ کوئی ۱۹۳۲ء کی بات ہے۔ دہلی میں ہوائی سفر کی شروعات ہوئی تھی۔ ایک تفریحی سفر دہلی تا الہ آباد کا آغاز ہوا۔ بھائی جان محترم، جناب عبدالحمید صاحب نے ہوائی جہاز میں سفر کا فیصلہ کیا۔ ان کو لینے کے لیے موٹر کار آئی۔ میں بھی ان کو موٹر کار تک چھوڑنے آیا۔ اُدھر وہ چلے اور اِدھر میری آپا (والدہ محترمہ) سجدے میں دعا کر رہی تھیں کہ خیر سے جائیں، خیر سے آئیں۔ میرے دل میں خیال آیا: ذرا دیکھو تو بھائی جان کو! اکیلے جا رہے ہیں۔ ہمیں اگر ساتھ لے چلتے تو کیا بگڑ جاتا۔ موٹر کار روانہ ہوگئی اور میں ان کو دیکھتا رہ گیا۔ اس وقت دل سے دعا نکلی تھی: اللہ تعالیٰ مجھے ہوائی جہاز میں سفر کا موقع عطا فرمائیں۔ بھئی نونہالو! وہ گھڑی دعا قبول کرنے کی تھی۔ ایسا تھا کہ اللہ تعالیٰ میری دعا سننے کے لیے تیار ہی بیٹھے تھے۔ زمین سے سیدھی عرش تک گئی۔ وہ دن اور آج کا دن، میں رات دن ہوائی جہازوں میں رہتا ہوں۔ دعا اس طرح قبول ہوتی ہے! اس ہوائی جہاز نے مجھے دنیا دکھادی۔ لاکھوں، لاکھوں میل اُڑ چکا ہوں۔

اے چیئر ان دی ائر

لو بھئی ایک واقعہ اور یاد آگیا۔ یہ ۱۹۵۲ء کی بات ہے۔ میں نے انڈونیشیا کا دورہ کیا تھا۔ بھائی جان محترم نے نہایت شان دار پروگرام بنایا تھا۔

یہ سفر ہم دونوں بھائیوں نے ساتھ کیا۔ ہمارے دوست جناب ڈاکٹر برکات احمد بھی میرے ساتھ تھے۔ ہائے ان دوست کا انتقال ہوگیا۔ خیر جناب انڈونیشیا پہنچے۔ مشرقی پاکستان، برما، تھائی لینڈ، سنگاپور، ملایا، فلی پینز سے دورہ ختم کر کے انڈونیشیا کا دورہ تھا۔ انڈونیشیا ائرلائنز کا نام "گرودا" ہے۔ اس کا موٹو ہے "اے چیئر ان دی ائر" یعنی ایک کرسی ہوا میں۔ اب جو ہم روانہ ہوئے اور جہاز میں اندر داخل ہوئے تو وہاں تو کوئی چیئر نہیں تھی! وہاں بنچیں تھیں! خیر ان بنچوں پر بیٹھ گیا۔ ہوائی جہاز زنّاٹے کے ساتھ اُڑا۔ ذرا ہی دیر بعد ڈانواں ڈول ہوگیا۔ غالباً آندھی میں جہاز گھِر گیا تھا۔ اس نے سب مسافروں کو خوب جھونٹے دیے۔ کبھی اوپر کبھی نیچے۔ اب گرا اور جب گرا! کئی مسافر، جنھوں نے پیٹی کسنے میں غفلت برتی تھی اوپر نیچے ہوگئے۔ بہت سے قے کر رہے تھے!

کہنا چاہیے کہ جہاز گرتے گرتے بچ گیا۔ ساری بنچیں بھی الٹ پلٹ ہوگئیں۔ آندھی رکی تو ذرا ہوش ٹھکانے ہوئے۔

خیر اب تو "گرودا" اچھی ائرلائن ہے۔ اب واقعی چیئر ان دی ائر ہے! اس کا بڑا سخت مقابلہ ہے۔ سنگاپور ائرلائنز، تھائی انٹرنیشنل پے سے فک، ملیشیا ائرلائنز، کنٹاس اوسٹریلین ائرلائنز، فلی پینز ائرویز، کتھائی پیسیفک وغیرہ۔ میں ان سب ائرلائنوں سے سفر کر چکا ہوں۔

دوحہ ائرپورٹ

میں نے کراچی سے دوحہ تک پاکستان انٹرنیشنل سے سفر کیا ہے۔ رات کھانا چھوڑ دیا تھا۔ اس لیے جہاز میں ناشتہ کرنے کی ٹھان لی تھی۔ شان

دار ہوائی جہاز' شان دار عملہ اور شان دار ناشتہ۔ نہایت اطمینان سے ناشتہ کیا' بلکہ دل چاہا کہ ایک اولیٹ اور مانگ لوں! مگر ایسا کرنا اچھا نہیں تھا۔ جہاز کا ناشتہ تو ناپ تول کا ہوتا ہے۔ شاید یہ بھی خیال رکھا جاتا ہے کہ مناسب حرارے یعنی کیلوریز ملیں' ضرورت سے زیادہ نہ ہو جائے۔ ان کو مسافروں کی صحت کا خیال رہتا ہے۔

ایک خاتون میزبان کو دیکھ کر خیال آیا کہ ان سے پوچھوں: "کیا آپ جہاز پر صبح نہاری سے تواضع نہیں فرماتیں!" پھر خیال آیا کہ یہ ماڈرن خاتون کیا جانے نہاری کیا ہے۔ وہ تو ہم جانتے ہیں۔ صبح نہاری' رات نہاری! کراچی میں گایوں بھینسوں کا قتلِ عام ہو رہا ہے اور نہاریاں پک رہی ہیں اور نوش جان کی جا رہی ہیں۔ پھر ماشاء اللہ کراچی والے خوب بیمار ہو رہے ہیں۔ ہسپتال انہی نہاریوں' قورموں اور بریانیوں کی وجہ سے خوب آباد ہیں! رات بارہ بارہ اور ایک ایک بجے شادی گھروں سے لوگ نکلتے ہیں' اور صبح ہسپتال پہنچ جاتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ شادی گھروں اور ہسپتالوں میں باہم معاہدہ ہے کہ ہم مہمانوں کو قورمے بریانیاں' تکّے کباب زندہ اور مُردہ جانوروں کے اس لذّت سے کھلائیں گے کہ کل نہیں تو پرسوں یہ سیدھے ہسپتال پہنچ جائیں گے۔ اور تو اور ہمارے عروس البلاد شہر کراچی میں جہاں روزانہ خون کے غازے انسانی چہروں پر ملے جاتے ہیں' ماشاء اللہ ایک ایسا ہوٹل بھی ہے جہاں کھانا کھا کر آدمی سیدھا "درمیان مشرق" ہسپتال پہنچ جاتا ہے!

متھرا کے چوبے

نونہالو! بات میں بات پیدا ہوتی چلی جا رہی ہے۔ تم شاید متھرا کے

چوبوں سے واقف نہیں ہو۔ دنیا کے پردے پر ایک مخلوق یہ بھی آباد ہے۔ اس مخلوق کے مرد کھانے کا مقابلہ کرتے ہیں۔ یہ ایک قسم کی مذہبی رسم بھی ہے۔ مقابلہ نہایت شان دار ہوتا ہے' ایسا ویسا نہیں ہوتا۔ مثلاً مقابلہ یہ ہے کہ پانچ سیر جلیبیاں کون کھا جائے۔ دونوں کے سامنے مٹھائی رکھ دی جاتی ہے۔ جو پوری کھا جائے! اگر دونوں کھا جائیں تو مقابلہ ختم نہیں ہوتا۔ ایک دو سیر جلیبیاں اور سامنے رکھ دی جاتی ہیں۔ ایک تو ہارتا ہی ہے!

متھرا ہندُستان کا ایک شہر ہے۔ یہاں ہندوؤں کے مذہبی اجتماعات ہوتے رہتے ہیں اور کھانے کے مقابلے بھی ہوتے رہتے ہیں۔ اب جو اصل بات ہے وہ یہ ہے کہ اس قدر مٹھائی جلیبیاں نوش شکم کرنے کے بعد یہ چوبے اپنے گھر کیسے پہنچتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ خود تو چل نہیں سکتے! اٹھا کر لے جائے جاتے ہیں۔ گھر پہنچتے ہیں تو بستر تیار ہوتا ہے اور فوراً جا کر بستر پر گر جاتے ہیں!

ایک جواں سال خاتون بیاہ کر متھرا کے ایک چوبے کے ہاں آئی۔ شام کو مقابلہ تھا۔ خسر مقابلے کے لیے گئے ہوئے تھے۔ ساس نے بہو سے کہا کہ بستر تیار کر دو' تمہارے ابّا آتے ہی بستر پر پڑ جائیں گے۔

یہ ہدایت سن کر جواں سال خاتون چیخیں مار مار کر زاروقطار رونے لگی۔ ساس نے پوچھا کہ ماجرا کیا ہے۔ بڑی مشکل سے بہو نے کہا:

"ہائے میں کس کنجوس گھر میں بیاہی گئی ہوں۔ ارے ہمارے ابّا کے ساتھ چارپائی جاتی تھی اور ابّا چارپائی پر پڑے آیا کرتے تھے! یہ کیسے ابّا ہیں کہ پیدل چل کر آئیں

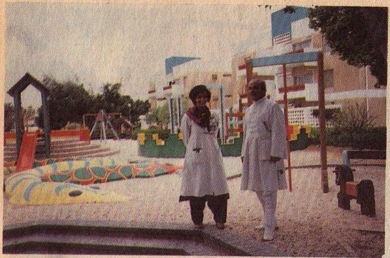
گے!"

دوحہ کے ہوائی میدان پر

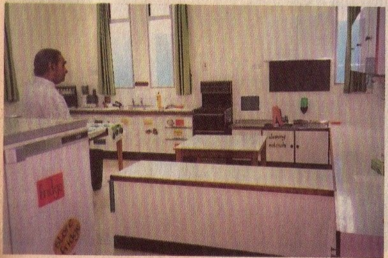
دوحہ کا ہوائی میدان میرے لیے کوئی نئی جگہ نہیں ہے۔ دوسرے ملکوں کو جاتے ہوئے بارہا یہاں سے گزرا ہوں۔ آج یہاں اتر رہا ہوں اور خوش ہوں۔ جہاز کے پاس میرے لیے ایک سفید موٹر کار آکر لگ گئی۔ میں اترا تو عالی جناب سفیرِ پاکستان موجود تھے۔ بڑا حیران ہوا۔ میں تو اب گورنر نہیں ہوں، پھر سفیرِ پاکستان نے یہ احترام کیوں کیا۔ معلوم ہوا کہ انتہائی شریف انسان ہیں۔ شریفوں کا احترام کرتے ہیں۔ دل کو بڑا اطمینان ہوا کہ ابھی یہ دنیا شریفوں سے خالی نہیں ہے۔ عالی مرتبت جناب لیاقت محمود سفیرِ پاکستان کے ساتھ عمارت میں آیا تو عزیزہ ڈاکٹر زینت موجود تھیں۔ ان کو سینے سے لگایا۔ نہایت پاکستان دوست خاتون ہیں۔ پاکستان کا دوست میرا دوست ہے۔ تمام انتظامات وی آئی پی، یعنی ویری امپورٹنٹ پرسن! جناب سفیر صاحب سے رخصت ہوا۔ عزیزہ زینت مجھے ہوٹل شیراٹن دوحہ لے آئیں۔ میں نے کہا: "بی بی، کیا تمہارے گھر میں کوئی اتنی جگہ نہیں ہے جہاں میں رات کو زمین پر پڑ رہتا! یہ ہوٹل تو مجھے باہر سے کاٹ رہا ہے، اندر جاؤں گا تو یہ مجھے نگل لے گا! مجھے بڑے ہوٹل سخت ناپسند ہیں!"

مگر ڈاکٹر زینت نہ مانیں اور یہاں ٹھیرادیا۔ کمرہ بھی معمولی نہیں سویٹ! یعنی ایسا کمرہ جس میں سونے کا ڈبل کمرہ، ایک ڈرائنگ روم، ایک ڈائننگ روم۔ وغیرہ۔ یعنی پورا گھر۔ اب یہ پورا گھر اور میں ایک یکہ و تنہا آدمی۔ اس کا کرایہ بھی پاکستانی رُپوں میں پانچ ہزار رُپے یومیہ۔ کمرے میں آیا

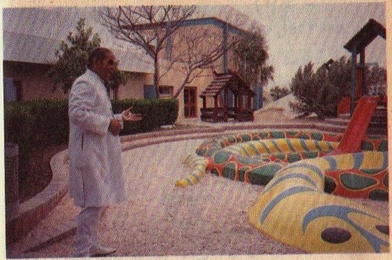
دوحہ انگلش اسکول



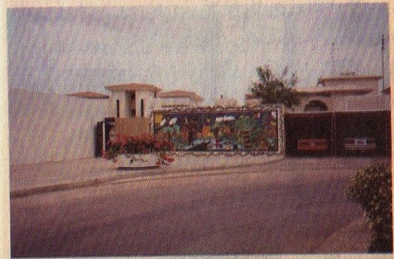
حکیم محمد سعید، ڈاکٹر زینت کھیل کے ایک علاقے میں



ننھی نونہالوں کو کھانا پکانا سکھانے کی کلاس روم



نونہالوں کے لیے ورزش کی ایک جگہ



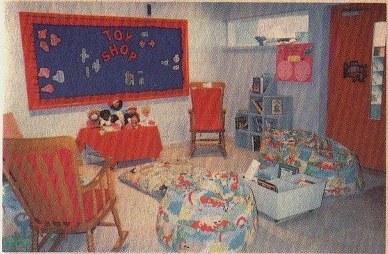
دوحہ انگلش اسکول میں ایک دیوار پر زیرِ تعلیم نونہالوں نے ایک پینٹنگ بنائی ہے



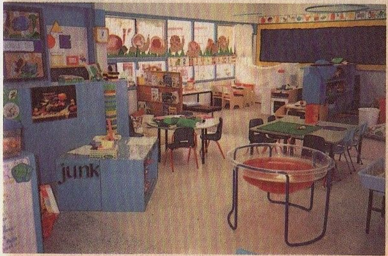
عام پائپوں کو خوش نُما رنگ کر کے رکھ دیا گیا ہے۔ نونہال اس میں جاتے آتے ہیں



کھیل کود کا ایک علاقہ



ننھے نونہالوں کا ایک کلاس روم



ننھے نونہالوں کے کھیلنے کا ایک کمرا

اور سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ فوراً خیال آیا کہ ڈاکٹر زینت پر یہ سخت بار ہوگا کہ وہ میرے رہنے کے پانچ ہزار رُپے روز خرچ کریں اور میں اس کمرے میں بے آرام رہوں۔ میں نیچے آیا۔ ہوٹل کے استقبالیہ سے کہا کہ میرا کمرہ بدل دیا جائے۔ مجھے سویٹ میں ٹھیرنا ناپسند ہے۔ جواب ملا' آپ کا دو راتوں کا کرایہ ڈاکٹر زینت ادا کرچکی ہیں!

نونہالو! بڑی ذہنی تکلیف ہوئی۔ فضول خرچی ہوئی۔ ڈاکٹر زینت زیرِ بار ہوئیں اور میں زیربار احسان۔ دونوں گھاٹے میں رہے۔ دونوں نے نقصان اٹھایا۔ مسلمانوں کا پیسہ اس لیے نہیں ہے کہ اسے اس طرح کے آرام پر خرچ کیا جائے۔ مسلمان کو اپنا ایک ایک پیسہ احتیاط سے خرچ کرنا چاہیے۔

میں نے اوپر کمرے میں آکر ایک جائزہ پھر لیا۔ اپنے لیے ایک کونہ چن لیا۔ ایک غسل خانہ پسند کرلیا اور گویا باقی پورے کمرے کو میں نے اپنے ذہن سے نکال دیا۔

نونہالو! یہ بڑے بڑے ہوٹل امریکا کے تجارت خانے ہیں۔ ان کو مسلمانوں کی کم زوریاں معلوم ہوگئی ہیں۔ ان سے وہ پورا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ تم کو میں نے پرانے دوحہ کی تاریخ بتائی ہے۔ یہ ایک صحرائی ملک تھا' جہاں ہوٹل تو کیا ریستوراں بھی نہ تھا! اس وقت یہ تاجر آکر تعمیر میں حصّہ لیتے تو بات ہوتی۔ اب تو یہ یہاں دولتیں سمیٹنے آئے ہیں' اور خوب کمارہے ہیں۔ عیش و عشرت کا ہر سامان انھوں نے کردیا ہے تا کہ سادگی اور قناعت ختم ہوجائے۔ قطر کی دولت امریکا چلی جائے۔ سچ یہ ہے کہ دولت کا یہ نہایت غلط

حسرت موہانی ہے!"

ہوٹل کی ایک گُل دستہ میز

نمازِ ظہر ادا کر کے میں نے ہوٹل کے کمرے کے برآمدے کا جائزہ لیا۔ یہاں ایک میز رکھی تھی اور اس پر ایک گُل دان سجا ہوا تھا۔ نہ جانے یہ پھول کہاں سے آئے ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ دوحہ کی سرزمین تو پھول نہیں اُگا سکتی۔ اُگا سکتی ہے تو کون یہ محنت کرے! پھول اُگانا آسان کام تو نہیں ہے! اس ہوٹل میں ہر کمرے میں اور باہر جگہ جگہ پھول رکھے ہیں۔ آرائش اور زیبائش کے لیے یہ پھول باہر سے درآمد کیے جاتے ہیں۔ ان پر ہزارہا ڈالر روزانہ خرچ ہوتے ہیں۔ مغربی ملکوں سے عرب دنیا میں لاکھوں لاکھ رُپوں کے پھول روزانہ خریدے جاتے ہیں۔

نونہالو! اس سخت اندھیرے میں ایک روشنی یہ ہے کہ اب سعودی عرب نے اتنے پھول پیدا کر لیے ہیں کہ وہاں سے دوسرے ملکوں کو جاتے ہیں۔ یہ وہی سعودی عرب ہے جہاں سالہا سال پہلے جب سربراہانِ اسلامی ممالک کی کانفرنس ہوئی تو زیبائش کے لیے ایک ملین ڈالر کے پھول ہالینڈ سے روز آیا کرتے تھے! یہ کروڑ رُپے ہوئے!

خیر جناب، میں نے نہایت خوب صورت گُل داں کو اس میز پر سے اٹھایا اور پھولوں سمیت اندر اس کمرے میں رکھ دیا جسے میں نے اپنے لیے بند کر دیا تھا، اور اس میز پر اپنے فائل جما دیے۔ ورانڈہ یعنی بالکنی خوب جگہ ہے۔ سامنے سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ روشنی فراواں ہے۔ میں نے اسے اپنے لکھنے کی جگہ بنا لیا۔

ایک فیصلہ

نونہالو! جب یہاں سکون میسّر ہے اور آسائش فراواں ہیں تو پھر مجھے یہاں کوئی کام کر لینا چاہیے۔ مجھے اپنے نونہالوں کے لیے ایک کتاب لکھنی تھی: "سپہ سالارِ اسلام — مدینۃ الحکمت میں" میں نے فیصلہ کیا دن اپنا نہیں ہے تو رات تو اپنی ہے۔ بس یہ کتاب یہاں لکھ لوں گا۔ اس سے اچھا اور موقع نہیں ملے گا۔ سپہ سالارِ اسلام محمد بن قاسم سندھ کب آئے، کیسے آئے، کہاں پہلا پڑاؤ کیا، پھر سندھ میں کیا انقلاب برپا کیا۔ بڑی دل چسپ بات یہ ہے کہ محمد بن قاسم شیراز نے بہ راہ بیلا ہوتے ہوئے جب سندھ کی سرزمین پر جہاں قدم رکھا اسی سرزمین پر آج مدینۃ الحکمت ایک شہرِ علم آباد ہو رہا ہے۔ اس لیے میں نے کتاب کا نام دیا ہے کہ سپہ سالارِ اسلام مدینۃ الحکمت میں۔ اس کے بعد پاکستان کی افواج کے سپہ سالار جناب محترم جنرل عبدالوحید صاحب مدینۃ الحکمت تشریف لائے۔ محمد بن قاسم سے بات شروع کر کے جنرل عبدالوحید پر ختم کی ہے۔

نونہالو! میری یہ کتاب چھپ گئی ہے جو میں نے دوحہ میں بیٹھ کر لکھی ہے!

افطار

نونہالو! اسلامی شرع اس کی اجازت دیتی ہے کہ سفر میں رمضان المبارک کا فرض روزہ چھوڑا جا سکتا ہے۔ اسے بعد از رمضان رکھا جا سکتا ہے۔ سفر میں انسان کو ایسے حالات سے واسطہ پڑتا ہے کہ پابندیاں نہیں ہو سکتیں۔ تکلیف ہو سکتی ہے اور تکلف بھی۔ مثلاً رمضان کا مہینہ ہے۔ سفر

امریکا کا ہے۔ وہاں کام کرتے ہیں۔ اب واسطہ امریکیوں سے ہے۔ روزہ کی حالت میں جس کام کے لیے آئے ہیں اس میں خلل پڑ سکتا ہے۔ اسلام ایک فطری دین ہے۔ یہ دین مسلمان کو کسی تکلیف میں ڈالنا نہیں چاہتا۔ یہ فیصلہ ہر زمانے کے لیے ہے۔ چودہ سو سال پہلے سفر سخت مشکل تھے۔ اس وقت سفر کی شدتوں میں روزے رکھنا ممکن نہیں تھا۔ چودہ سو سال پہلے کی بات تو ہے ہی، مگر میں ۱۹۲۷ء کی بات کرتا ہوں۔ اسی صدی کی۔ میں نے پہلا حج ۱۹۲۷ء میں کیا تھا۔ اس وقت مکتہ المکرّمہ سے مدینتہ المنوّرہ ہم اونٹوں پر گئے تھے۔ ۱۷ دن میں پہنچے تھے۔ اگر یہ سفر رمضان میں ہوتا تو روزہ رکھنا کیسے ہو سکتا تھا۔ آج یہی سفر ۱۷ منٹ میں طے ہو جاتا ہے۔ جدّہ سے ہوائی جہاز اُڑ کر ۱۷-۱۸ منٹ میں مدینہ لے جا کر اتار دیتا ہے۔ ایسے سفر میں روزہ چھوڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔

ایک روزہ یاد آیا اپنا

میں کئی سال ہوئے ڈنمارک کے دارالحکومت کوپن ہیگن میں تھا۔ ایک عالمی کانگرس تھی ایکوپنکچر پر۔ یہ ایکوپنکچر ایک چینی طریقِ علاج ہے جس میں انسانی جسم کے خاص خاص مقامات پر نہایت باریک سوئیاں چبھو کر لگا دی جاتی ہیں۔ خاص خاص مرضوں کے لیے خاص خاص مقامات ہوتے ہیں۔ بڑے فائدے کا علاج ہے۔

رمضان کا مہینہ تھا۔ ڈنمارک میں ان دنوں انتہائے سحر صبح دو بج کر پانچ منٹ تھا اور افطار کا وقت رات نو بجنے میں پانچ منٹ۔ گویا روزہ انیس گھنٹے کا تھا۔ میں نے یہاں بھی روزے ترک نہیں کیے، بلکہ میری بیٹی سعدیہ

ساتھ تھیں، انھوں نے بھی ہمت کر کے روزے رکھ لیے تھے۔ یہ ایسا سفر تھا کہ روزہ چھوڑ دینا چاہیے تھا، مگر میرا دل نہ مانا۔ مجھے یاد نہیں کہ ۱۹۳۵ء سے آج تک میں نے رمضان المبارک کا کوئی روزہ چھوڑا ہو۔

نونہالو! لطیفہ یہ ہوا کہ صبح روزے کی نیّت کر لی۔ یہ یاد نہ رہا کہ آج کوپن ہیگن سے نیویارک (امریکا) جانا ہے۔ اب تو روزہ رکھ لیا تھا۔ اللہ مالک ہے۔ ڈنمارک کے وقت میں اور نیویارک کے وقت میں کوئی سات گھنٹے کا فرق۔ یعنی جب نیویارک اترے تو ابھی دن تھا۔ ڈنمارک میں رات ہو چکی تھی۔ اب میرا روزہ انیس گھنٹے میں سات گھنٹے اور اضافہ ہو گئے۔ یعنی چھبیس گھنٹے کا روزہ ہو گیا!—— بڑا مزہ آیا تھا!

خیر آج شام عزیزہ ڈاکٹر زینت نے اپنے گھر پر افطار کا انتظام کیا تھا۔ شام ان کے گھر پہنچ گیا۔ نہایت شان دار گھر۔ پاک اور پاکیزہ۔ یہاں حیدر آباد دکن کے ایک ڈاکٹر صاحب سے ملاقات ہو گئی۔ وہ بھی دوحہ ہسپتال میں کام کرتے ہیں۔ حیدر آباد دکن کے ہیں۔ ہوٹل شیراٹن کے نہایت مستعد اور سرگرم منیجر بھی آ گئے تھے۔ کھجور سے افطار کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ قریب ہی مسجد ہے نماز باجماعت ادا کریں گے۔

دل خوش نہیں ہوا۔ اتنی بڑی سرکاری کولونی ہے، مسجد نہیں ہے۔ بس ایک شیڈ ہے، اسے مسجد بنا لیا گیا ہے۔ مگر ضرورت کی ہر چیز ہے۔ لاؤڈ اسپیکر بھی ہے۔ اذان جناب ڈاکٹر صاحب نے دی۔ چند نمازی آ گئے۔ باجماعت نماز ہو گئی۔

کھانا نہایت لذیذ تھا اور افراط سے تھا۔ فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا کہ کیا

کھاؤں اور کیا چھوڑوں۔ چھوڑوں تو کس دل سے! دل تو کہتا ہے کہ ہر چیز کھانی چاہیے۔

ایک کیا دو واقعے!

ایک جگہ کھانا تھا۔ میز پر انواع و اقسام کے کھانے چُنے ہوئے تھے۔ مہمانوں نے دل بھر کر ہر چیز نوش جان کی۔ کھانا ختم ہوا۔ دعا ہوئی۔ اچانک دیکھا کہ ایک مہمان زاروقطار رونے لگے۔ سب بڑے حیران پریشان۔ ماجرا کیا ہے۔ پوچھا تو بڑی حسرت سے فرمایا: "اب یہ کھانا جو بچا ہے یہاں سے اُٹھ جائے گا!"

دوسرا واقعہ برِصغیر کے ایک نام ور ادیب جناب محترم مولانا عبدالرزاق کا ہے۔ کھانے پر دوستوں کے ساتھ مصروف اکل و شرب تھے۔ خوب کھایا اور پھر ہاتھ کھینچ لیا۔ میزبان نے لاکھ اصرار کیا۔ مولانا ذرا سا اور! مگر مولانا نے فرمایا: "اللہ کا شکر ہے پورا کھایا ہے۔ کوئی رُو رعایت نہیں کی ہے۔"

میزبان نے ادب سے کہا: "مولانا! یہ تو رات کا کھانا ہوگیا۔ ایسا کیجیے صبح کا ناشتہ ابھی کرلیجیے!" بات مذاق کی تھی مگر دیکھا کہ مولانا تیار ہوگئے اور دوبارہ کھانا شروع کردیا!

اچھا، میں تو سحری پر ذرا بھی کچھ نہیں کھاتا۔ ۱۹۴۰ء سے آج تک میں نے سحری نہیں کھائی ہے۔ صبح تہجّد کے وقت اٹھ جاتا ہوں۔ پانی خوب نوش جاں کرتا ہوں، مگر کھانا ذرا بھی نہیں۔ ان دنوں تو میں مہینے میں ۱۵۔۱۶ روزے رکھتا ہوں۔ ۱۷۔۱۸ سال سے یہ معمول ہے کہ جس دن مریضوں کو دیکھتا ہوں

اس دن روزہ رکھتا ہوں۔

۱۷/ مارچ ۱۹۹۴ء

شان دار نیند

نونہالو! کل رات کو میں ورانڈے میں پڑے ہوئے لوہے کے صوفے پر سوگیا۔ اس سویٹ میں بیڈ روم بڑے غضب کا ہے۔ کم خواب کے پردے، ایسا شان دار پلنگ کہ دیکھتے رہ جائیں۔ اس پر بستر ایسا کہ مکھی تک کے پیر پھسل جائیں۔ خوب ٹھنڈا، مگر میں نے اسے دیکھ کر چھوڑ دیا۔ ورانڈے میں آکر لیٹ گیا۔ بڑی شان دار نیند آئی۔

نونہالو! آج کل تو یہ فیشن ہوگیا ہے کہ بڑے لوگ رات نیند کی گولی کھاکر سوتے ہیں۔ نہایت بُری عادت ہے، مگر یہ عادت بین الاقوامی ہے۔ یورپ ہو یا امریکا، کینیڈا، خواب آور گولی کے بغیر لوگوں کو نیند نہیں آتی۔ ان کی دواساز کمپنیاں اب زیادہ تر ان گولیوں پر اپنی صنعت قائم کیے ہوئے ہیں۔ دراصل یہ وہ لوگ ہیں جن کو قلبی سکون حاصل نہیں ہے۔ دولت اگر ایک ہے تو اسے دو بنانے کی فکر لگی رہتی ہے۔ پھر دولت کمانے کے راستے غیر شرعی۔ ایسے لوگوں کا ضمیر ان کو رات دن ملامت کرتا رہتا ہے۔ یہ لوگ اطمینانِ قلب سے محروم ہوتے ہیں۔ ان کو نیند لانے کی گولیاں کھانی پڑتی ہیں۔

لاحول ولا قوۃ! یہ بھی کوئی زندگی ہے! ایسی زندگی جس میں انسان کا ضمیر اسے ہروقت نوچتا رہتا ہو وہ زندگی کہاں ہے، عذاب ہے!

رات جلد سوگیا تھا۔ بس ایک ہی کروٹ سویا تھا۔ لوہے کے صوفے

پر کروٹ بدلنے کا کوئی موقع نہ تھا۔ دائیں کروٹ لیٹا۔ یہی سُنّت ہے۔ پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "سیدھی کروٹ زیادہ لیٹنا چاہیے' اس سے دل برباد نہیں ہوتا۔" خیر صبح جلد اٹھ گیا۔ نمازِ تہجّد ادا کی اور پھر یاحیی یا قیوم کی تسبیحاں پڑھتا رہا۔ فجر کا وقت ہوگیا۔ نماز فجر ادا کی۔ اس ہوٹل میں نیچے ایک جگہ نماز کے لیے بنی ہوئی ہے' مگر اس کا خیال دیر سے آیا۔ ورنہ نیچے جاکر جماعت سے نماز پڑھ لیتا۔ شاید جماعت ہوتی ہو۔

اس کے بعد اس میز پر جم گیا جہاں میں نے کل ہی اپنے فائل' کاغذات اور قلم وغیرہ سجا دیے تھے۔ اللہ کا نام لے کر کتاب لکھنی شروع کردی۔ صبح ۵ بجے سے آٹھ بجے تک بس لکھتا ہی رہا۔ محمد بن قاسم کے بارے میں نئی نئی باتیں ذہن میں آتی رہیں۔ اپنے عظیم نونہالوں کے لیے قلم برداشتہ لکھتا چلاگیا۔

خواتین ہسپتال

محترمہ ڈاکٹر زینت آگئیں۔ ان کے پاس بڑی شان دار کار ہے۔ وہ خود ڈرائیو کرتی ہیں۔ ان کے ساتھ خواتین ہسپتال پہنچ گیا۔ دوحہ کا یہ سب سے بڑا خواتین ہسپتال ہے۔ دن کے ایک بجے تک اس کا ہر ہر شعبہ دیکھا۔ یہاں مجھے اور ڈاکٹر زینت کو ہسپتال کا لباس پہننا پڑا جو ہر قسم کے انفیکشن سے پاک تھا۔ اس ہسپتال کا شمار دنیا کے اچھے ہسپتالوں میں ہوتا ہے۔ دنیا کا ہر جدید طبّی سازوسامان یہاں موجود ہے۔

نونہالو! میں یہ ہسپتال اس لیے دیکھنے آیا ہوں کہ مدینۃ الحکمت میں ایک ہسپتال میں قائم کرنا چاہتاہوں۔ دوحہ کا یہ خواتین ہسپتال ایک اعلا

نمونہ ہے۔ اس ہسپتال میں ڈاکٹر زینت نائب صدر کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس کے صدر میرے پرانے جاننے والے ڈاکٹر عمر۔ ایچ۔ ششو صاحب ہیں۔ مصری ہیں۔ اکثر باہر رہتے ہیں۔ ڈاکٹر زینت اتنے بڑے ہسپتال کو سنبھالتی ہیں۔

نونہالو! ڈاکٹر مس پیٹرز اس ہسپتال میں نرسنگ کی نگرانِ اعلا ہیں۔ کہنا چاہیے کہ اس کرسچین خاتون نے پورا کنٹرول کیا ہوا ہے۔ اس ہسپتال میں سیکڑوں نرسیں ہیں' سیکڑوں ڈاکٹر ہیں' سیکڑوں کارکن ہیں۔

ملاقاتیں

اس ہسپتال میں جن اہم شخصیات سے شرفِ ملاقات حاصل ہوا' ان میں
جناب محترم ڈاکٹر فاروق حبیب
اور جناب محترم ڈاکٹر سلطان جوہر قابلِ ذکر ہیں۔

محترمی ڈاکٹر سلطان جوہر قطری جواں سال مستعد انسان ہیں۔ ان کے ساتھ میں نے زیادہ وقت گزارا۔ اندازہ یہ ہے کہ خواتین ہسپتال کے یہ اب ڈائریکٹر بن جائیں گے۔ شاہی خاندان سے ہیں۔ خلیفہ قطر کے قریب تر ہیں۔

جناب افغانی صاحب

ڈاکٹر زینت کے ساتھ میں جناب محترم افغانی صاحب کے دفتر گیا۔ یہ ایک ادارے کے بانی ڈائریکٹر ہیں جس نے ہسپتالوں کی منصوبہ بندی میں مہارت حاصل کی ہے۔ ان سے تبادلِ خیال اچھا رہا۔ غالباً مدینۃ الحکمت میں ایک ہسپتال کی تعمیر کے لیے ان کے ماہرانہ مشورے کی ضرورت ہوگی۔

دوحہ انگلش اسکول

میری طرح ڈاکٹر زینت بھی دن کا کھانا نہیں کھاتی ہیں۔ میں نے ان سے کہا: "وقت تو ہے، آؤ ذرا دوحہ میں کوئی ایک پرائمری اسکول دیکھ لیں۔" ڈاکٹر زینت کی بیٹی دوحہ انگلش اسکول میں پڑھتی ہیں۔ بس فیصلہ ہوا کہ اسے جاکر دیکھ لیں۔ پرنسپل وغیرہ جاننے والے ہیں۔

نونہالو! دوحہ انگلش اسکول انگریزوں نے قائم کیا ہے۔ اس اسکول میں انگریز بچے نیز دوسرے یورپ امریکا کے بچے تعلیم حاصل کرتے ہیں، لیکن قطر کے نونہال بھی ہیں اور دوسرے ممالک کے بھی۔ تعلیم کے معاملے میں انگریز کا مزاج صاف ستھرا ہے، اسی لیے دوحہ پبلک اسکول ایک قابلِ دید اسکول ہے۔ بے اختیار میں نے اس کی داد دی۔

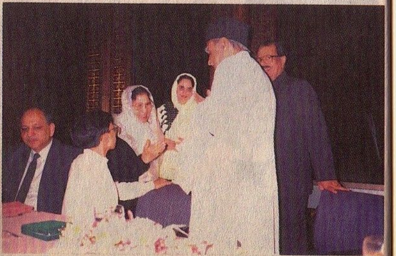
دوحہ پبلک اسکول کے پرنسل جناب ڈاکٹر آئی۔ آر۔ فریتھ ہیں۔ نہایت ہنس مکھ انسان۔ تعلیم و تربیت کے دل دادہ۔ ان کا اسکول اس کی گواہی دیتا ہے کہ پرنسپل فریتھ رات دن اس درس گاہ کے لیے سوچتے ہیں اور کام کرتے ہیں۔ معیارِ تعلیم کو ہر انداز بلند کرنا ان کا دل پسند مشغلہ ہے۔

ڈاکٹر فریتھ نے ہمارا استقبال کیا۔ بہت پُرجوش اور پھر تقریباً ایک گھنٹے میں انھوں نے ہمیں ایک ایک جگہ دکھادی۔ سب سے دل چسپ بات یہ کہ اس دوحہ انگلش اسکول میں کوئی کلاس روم ایسا نہیں ہے جہاں بکثرت کتابیں نہ ہوں۔ یعنی طالبِ علم کی نگاہ جس طرح اٹھتی ہے ہر طرف اسے کتابیں ہی دکھائی دیتی ہیں۔

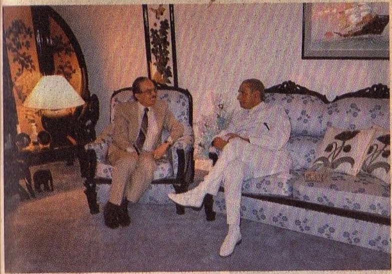
عظیم نونہالو! میرا دل چاہا کہ میں تم کو بھی اس اچھے اسکول کی سیر



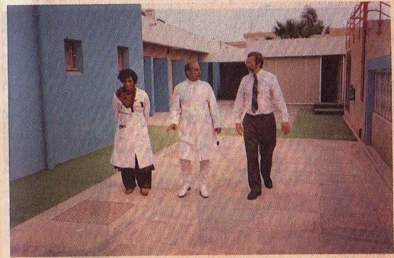
افطاریہ۔عشائیہ — محترمہ ڈاکٹر زینت۔حکیم محمد سعید۔محترم لیاقت محمود سفیرِ پاکستان



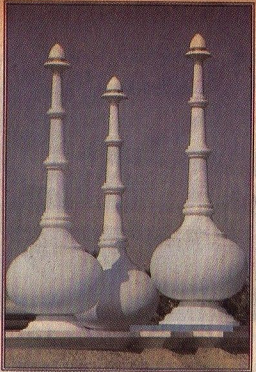
افطاریہ، عشائیہ — محترمہ ہمشیر ڈاکٹر زینت۔عزیز فرزند ڈاکٹر زینت



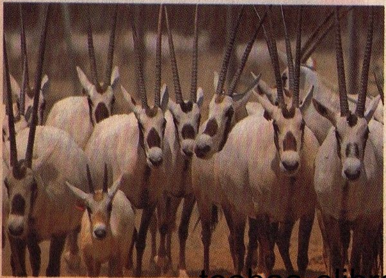
حکیم محمد سعید، جناب محترم ڈاکٹر



دوحہ انگلش اسکول کے پرنسپل ڈاکٹر فریحہ - حکیم محمد سعید - ڈاکٹر زینت



دوحہ کی ایک سڑک پر آرائشی نشان



قطر کے سفید ہرن



القرقور — مچھلیاں پکڑنے کا خاص جال



قطر کا قومی میوزیم

کراؤں، اس لیے میں نے اپنا کیمرہ سنبھال لیا اور متعدد تصویریں تمہارے لیے تیار کرلی ہیں۔ تم اس کتاب میں ان تصویروں کو دیکھ کر خوش ہو جاؤ گے۔ تمہارا دل چاہے گا کہ پاکستان میں نونہالوں کے لیے ہر اسکول ایسا ہی ہو۔ یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ ایسا ہو سکتا ہے اور ضرور ہو سکتا ہے۔ بس محبت، محبت اور توجہ کی ضرورت ہے۔

دوحہ انگلش اسکول میں نونہالانِ تعلیم کے لیے کھیل کا علاقہ بھی ہے۔ نہایت دل چسپ۔ گو جگہ ذرا کم ہے۔ مگر اس کے باوجود کھیل کود کے لیے ہر چیز موجود ہے۔ ذرا تم تصویریں دل چسپی کے ساتھ دیکھو۔ درحقیقت یہ ایک حقیقی ضرورت ہے کہ تعلیم گاہوں میں نونہالوں کے لیے کھیل کے کم از کم اس قدر انتظامات تو ہوں۔ وہ کیا اسکول کہ جہاں بس کلاس روم ہوں اور بس۔ کھیل کود اور بھاگ دوڑ کا کوئی اہتمام نہ ہو!

نہایت شان دار افطار

نونہالو! حد ہوگئی۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ میری ڈاکٹر زینت اس قدر تکلّف برتیں گی! انھوں نے کہا: "افطار پر آج چند دوستوں کو مدعو کرلیا ہے۔ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ ہوٹل ہی میں انتظام کرلیا ہے!"

اب جو افطار کے وقت ہال میں پہنچا تو یہاں تو سو سے زیادہ خواتین و حضرات تھے! میں تو حیران رہ گیا! اس قدر گراں ہوٹل میں یہ گراں تر اہتمام۔ میرا تو دل بیٹھ گیا۔ ڈاکٹر زینت زیرِ بار ہوئیں۔ بس ایک سکون یہ تھا کہ دوحہ میں مقیم پاکستانیوں سے ملاقاتوں کا شرف حاصل ہوگیا! اس کی مجھے خود بڑی خواہش تھی۔

آج اندازہ ہوا کہ دوحہ میں ڈاکٹر زینت کس قدر ہر دل عزیز ہیں۔ انھوں نے اپنے حُسنِ فکر و عمل سے ایک ایک کو اپنا دوست بنایا ہے۔ ہر مرد عورت ان کی بے اندازہ عزّت کرتا ہے۔

افطار کے بعد نمازِ مغرب مجھے پڑھانے کا شرف حاصل ہوا۔ میں نے دعا کی کہ اہلِ پاکستان دوحہ میں پاکستان کا نام بلند کریں اور خدمت کے ذریعہ سے دل موہ لیں۔ نیز یہ کہ باہم اتّفاق سے رہیں۔ مل جُل کر اتحادِ اسلامی کا بہترین مظاہرہ کریں۔ اللہ کا شکر ہے کہ دوحہ میں پاکستانی متفرق اور منتشر نہیں ہیں۔ یہ بہت خوبی کی بات ہے۔

نمازِ مغرب کے بعد عشائیہ تھا۔ انواع و اقسام۔ دستِ خود دہانِ خود۔ میزوں پر درجنوں قسم کے کھانے موجود ہیں۔ خود آیئے۔ خود پسند کیجیے اور خود اطمینان سے کھایئے۔ کوئی روک ٹوک نہیں اور کوئی کمی نہیں۔ جس طرح ڈاکٹر زینت کا دل فراخ ہے اسی طرح کھانے فراواں ہیں۔

محترم جناب سفیرِ پاکستان لیاقت محمود بھی بہ نفسِ نفیس موجود تھے۔ میں نے ان کی خدمت میں ایک تحفہ پیش کیا۔ عشائیہ کے اختتام پر ایک ایک شریک سے میں نے جاکر شرفِ ملاقات حاصل کیا۔

اللہ تعالیٰ کا شکر ہے۔

۱۸/ مارچ ۱۹۹۴ء

نونہالو! دوحہ جس کام کے لیے میں آیا تھا کل میں نے تمام دن میں اسے ختم کرلیا۔ آج صبح میں نے قلم سنبھال لیا اور "سپہ سالارِ اسلام" (مدینۃ الحکمت میں) اپنی کتاب کو ختم کرلیا۔ کوئی پچاس صفحے تیار ہوگئے ہیں۔

یہ ایک دل چسپ کتاب بن گئی ہے یقیناً نونہال اسے دل چسپی سے پڑھیں گے۔ اس میں سپہ سالارِ اسلام غازی محمد بن قاسم کے حالات کو میں نے نونہالوں کے لیے لکھا ہے۔

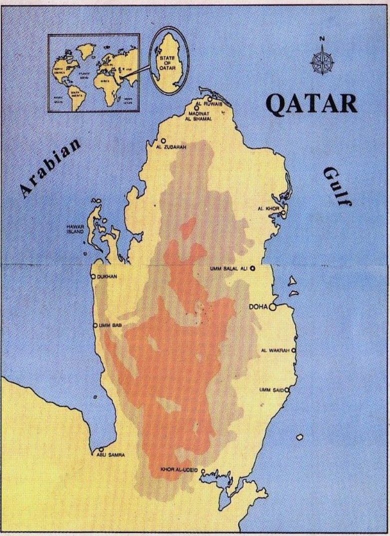
جناب محترم نور حسین شاہ

اُمّ سعید' قطر میں رہتے ہیں۔ جنگ اخبار کے نمائندے ہیں۔ نہایت محبّت کے آدمی ہیں۔ کئی کتابیں لکھ چکے ہیں اور شائع کرچکے ہیں۔ ان میں ایک کتاب "بجلی گری نشیمن پر" میرے نام معنون کی ہے۔ وہ مجھے غائبانہ جانتے ہیں۔ اس کے باوجود ایک کتاب میرے نام کردی۔ میں نے ان کا تہ دل سے شکریہ ادا کیا۔

انھوں نے "جنگ" کے لیے ایک انٹرویو کے لیے ارشاد فرمایا۔ میں نے ان کو واضح طور پر بتادیا کہ جنگ کو ان دنوں سوء مزاج لاحق ہے۔ اسے توڑنے موڑنے میں لطف آنے لگا ہے۔ اس لیے میں انٹرویو سے گریز کروں گا۔ اس کے باوجود جناب نور حسین شاہ نہ مانے۔ چند سوالات کے جوابات دے دیے ہیں۔ اب دیکھیں کہ عملہ جنگ ان کا کیا حشر کرتا ہے۔ جو صحافت' امانت' دیانت اور صداقت سے خالی ہوجائے وہ تجارت بن جاتی ہے اور حُسنِ صحافت کھو بیٹھتی ہے۔ اس صورتِ حال میں مال و دولت کا غرور جب شامل ہوجائے تو پھر یہ صحافت نہیں رہتی کثافت بن جاتی ہے۔

نونہالو! دوحہ میں آج آخری دن تھا۔ شام کے جہاز سے دوحہ سے روانہ ہوکر بہ خیریت تمام کراچی پہنچ گیا۔

ان حضرات کے اسمائے گرامی جن کا تذکرہ اس سفرنامے میں ہے



نونہال ادب

ہمدرد فاؤنڈیشن پریس، کراچی

طوبیٰ ریسرچ لائبریری

اسلامی اردو، انگلش کتب،

تاریخی، سفرنامے، لغات،

اردو ادب، آپ بیتی، نقد و تجزیہ

toobaa-elibrary.blogspot.com